مجموعۂ مقالات

مولانا محمد منظور نعمانی

مولانا محمد اویس ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

تصوف کیا ہے؟

مجموعہ مقالات

مولانا محمد منظور نعمانی

مولانا محمد اویس ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

www.KitaboSunnat.com

ادارہ اسلامیات

۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

بار اوّل عکسی ـــــــــ شوال ۱۴۰۱ھ ، اگست ۱۹۸۱ء
باہتمام ـــــــــ اشرف برادران سلمہم الرحمٰن
ناشر ـــــــــ ادارۂ اسلامیات ۔ لاہور
طباعت ـــــــــ تجارت پریس لاہور ۔
قیمت ـــــــــ ۶/- روپے
تعداد ـــــــــ ایک ہزار

ـــــ ملنے کے پتے ـــــ
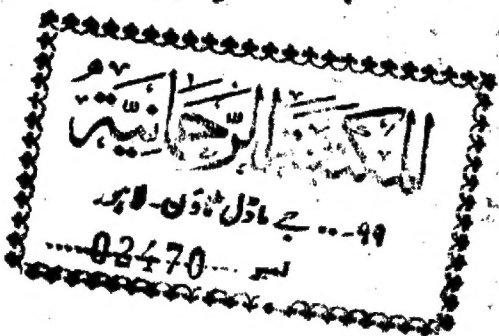
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ ۔ انار کلی لاہور
دارالاشاعت اردو بازار ۔ کراچی نمبر ۱
ادارۃ المعارف ۔ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دارالعلوم ، دارالعلوم ، کراچی نمبر ۱۴

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۳۷۱ھ، ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ختم ہو کر نایاب ہو گئی تھی۔ تقریباً بیس سال سے اسکا کوئی نسخہ دستیاب نہیں تھا۔ "کتب خانہ الفرقان" میں بھی اتفاق سے اس کا کوئی نسخہ محفوظ نہیں رہا تھا۔ شائقین کے اصرار نے جب مجبور کیا تو ایک صاحب سے اس کا نسخہ حاصل کر کے کتابت کرائی گئی اور آفسٹ سے اُسکی طباعت کا انتظام کیا گیا۔ اتفاق سے کاغذ بھی اس وقت بیحد گراں ہے۔ اس مجبوری سے قیمت بھی زیادہ رکھنی پڑی جس کا خود ہمیں احساس ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس میں ہمیں معذور سمجھیں گے۔

ناظم کتب خانہ "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ
۵ر اکتوبر ۱۹۷۳ء

نوٹ:۔ اب مولانا غلام رسول صاحب مدظلہٗ (جامعہ رشیدیہ ساہیوال) کی اجازت سے "ادارۂ اسلامیات" لاہور کو پہلی بار پاکستان میں یہ کتاب طبع کرانے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین!

اشرف برادران، ادارۂ اسلامیات، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس "دین الحق" اور زندگی کے جس طریقہ کی طرف دُنیا کو دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس کا کامل ترین نمونہ خود آپ کی ذاتِ مقدس تھی۔ اس لیے آپ کا طریقۂ زندگی ہی وہ "دین الحق" اور وہ "صراطِ مستقیم" ہے جس پر چل کر بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت کا مستحق بلکہ اس کا محبوب بھی بن جاتا ہے۔ آپ کے اس طریقۂ زندگی اور اسوۂ حسنہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل تین شعبے دریافت ہوتے ہیں۔

۱۔ ایمان۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، وحی و رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر نشر اور جنت و دوزخ، جیسی غیبی حقیقتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبریں دی ہیں اور جو کچھ بتلایا ہے، اُس سب کو حق ماننا اور دل سے اُس کی تصدیق کرنا۔ یہ دینِ حق کا سب سے اہم شعبہ ہے اور پُورے دین کی اساس و بنیاد ہے اور یہی شعبہ ہمارے علم عقائد کا موضوع ہے۔

۲۔ اعمالِ صالحہ: یہاں اس سے ہماری مراد دین کا وہ تمام تر عمل حصہ ہے جو جوارح یعنی ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتا ہے، جس میں

اسلامی عبادات اور دعوت و جہاد اور معاملات و آداب معاشرت وغیرہ داخل ہیں۔ یہ شعبہ گویا دین کا پورا قالب ہے اور یہی اسلام کا عملی نظام ہے اور ہمارے علم فقہ کا خاص تعلق اسی شعبہ سے ہے۔

۳۔ روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیۂ اخلاق :۔ جن لوگوں کی کتاب و سنت پر کچھ نظر ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہوسکتے کہ حضرت رسول اللہ نے جس طرح ایمانیات و اعتقادات اور عبادات اور آداب معاشرت و معاملات کے ابواب میں اپنی تعلیم و ہدایت اور عملی نمونہ سے اُمت کی رہنمائی فرمائی ہے اسی طرح آپ نے اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت، یقین و توکل، احسان و اخلاص جیسی روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیۂ اخلاق کے متعلق بھی اہم ہدایات دی ہیں اور ان کا نہایت اعلیٰ اور مثالی نمونہ امت کے لیے چھوڑا ہے۔ الغرض ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرح یہ بھی دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے اور یہی تصوف و سلوک کا خاص موضوع ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات تو ان تینوں شعبوں کی یکساں طور پر جامع تھی اور کسی درجہ میں ایسی ہی جامعیت اکابر صحابہؓ کو بھی حاصل تھی۔ لیکن بعد کے قرنوں میں زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اکثر وارثین و نائبین اگرچہ ذاتی طور پر کم و بیش ان تینوں شعبوں کے حامل اور جامع ہوتے تھے لیکن اپنی اپنی صلاحیت و استعداد اور ذوق یا ماحول کے مطابق انہوں نے کسی ایک شعبہ کی خدمت سے اپنا خاص تعلق رکھا اور بے شک بعد کے ان قرنوں میں دین کا پھیلاؤ جس درجہ بڑھ گیا تھا اور جو حالات پیدا ہو گئے تھے اُن میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ اس

صُورت اور اس تقسیم عمل نے خواص اُمت میں ائمہ عقائد، فقہا اور صوفیاء کے الگ الگ طبقے پیدا کئے۔

پس جس طرح ائمہ عقائد اور فقہاء نے خصوصیت کے ساتھ دین کے پہلے دو شعبوں کی حفاظت اور تنقیح و تفصیل کی اسی طرح حضرات صوفیاء نے دین کے تیسرے اہم شعبہ کی خدمت و حفاظت اور اس باب میں آنحضرتؐ کی نمائندگی و نیابت کی۔ اور اس لیے امت پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان ہے اور دین کے اس تکمیلی شعبہ میں امت ان کی خدمات کی ممنون اور محتاج ہے۔

پس سلوک و تصوف کی اصل غرض و غایت اور صوفیاء کرام کی مساعی کا اصل نصب العین دراصل دین کا یہی تیسرا شعبہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت اور اخلاص و احسان اور زہد و توکل جیسی روحانی و قلبی صفات و کیفیات کی تحصیل اور اخلاق کا تزکیہ لیکن چونکہ یہ چیزیں صرف کتابی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ ان کا صحیح ادراک بھی نہیں ہوتا اور اس دولت کے کسی وارث اور حامل کی صحبت و خدمت میں رہ کر مشاہدۂ آثار ہی کی راہ سے ان کی کچھ معرفت ہوتی ہے اور پھر اُن کے حصول کے متعلق بھی عام سنت اللہ چونکہ یہی ہے کہ اس کے حاملین کی صحبت و رفاقت اور تربیت ہی اس کا عام ذریعہ ہے اسلئے ایسے لوگ اس شعبہ سے اکثر محروم اور اُس کی معرفت سے بھی قاصر رہتے ہیں جنکو کسی ایسے بندہ کی صحبت و رفاقت کی توفیق نہ ملی ہو جو اس دولت کا حامل ہو۔

ہمارے اس زمانہ میں جو بہت سی نئی چیزیں اور نئے حالات پیدا ہوئے ہیں ~~انہیں ایک یہ بھی ہے~~ کہ وسائلِ نشر و اشاعت کی وسعت اور کتابوں کی

کثرت نے بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے ہیں جو دین کو صرف کتابوں اور رسالوں کے صفحات سے حاصل کرتے ہیں (اور یہ چیز فی نفسہٖ کچھ بُری نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے اچھی ہی ہے کہ اس طرح دینی افادہ و استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے) لیکن چونکہ ان کو دین کے کسی ایسے بالاتر نمونے کے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوتا جو خصوصیت سے اس تیسرے شعبہ کا بھی حامل ہو اور جسکو دیکھ کر یہ اپنے علم و عمل کو ناقص و نارسیدہ اور اپنی دینی معرفت کو ناتمام سمجھ سکیں۔ اس لیے بسا اوقات یہ حضرات اس زعم میں مُبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اور لٹریچر کی راہ سے جو ہم نے جان بُوجھ لیا ہے۔ بس یہی "کل دین" ہے اور چونکہ آج کل کا عام پسند دینی لٹریچر زیادہ تر ایسے ہی اہلِ علم و اصحابِ قلم کا تیار کیا ہُوا ہے جو خود اس مرض میں مبتلا ہیں، اس لیے وہ اپنے ناظرین کو اس بیماری سے نکالنے کے بجائے اُن کے مرض کو اور زیادہ راسخ اور سنگین کر دیتا ہے اور اس سے زیادہ رنج و افسوس کی بات یہ ہے کہ اس محرومی میں ہمارے قدیم دینی مدارس کے پڑھے ہوئے وہ بہت سے فضلا بھی اس کتابی طبقے کے شریکِ حال ہیں جو کسی وجہ سے اس شعبہ سے ناآشنا ہونے کے باوجود اسی زعم میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور اس لیے دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب اور تحصیل کا کوئی داعیہ اُن کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔

اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ تعجب اور موجبِ حیرت رویہ بعض اُن حضرات کا ہے جو حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہؒ، امیر المؤمنین سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کو اپنے اپنے زمانوں کا مجدّد اور دین و سنّت

کو زندہ کرنے والا مانتے ہیں اور اس کے ساتھ تصوف کو ضلال مبین بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ جس کسی نے حضرت مجدد کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ رح کی تصانیف اور شاہ اسماعیل شہید رح کی عبقات" اور منصب امامت اور حضرت سید احمد شہید رح کے مجموعۂ ملفوظات "صراطِ مستقیم" کا مطالعہ کیا ہو وہ اس حقیقت سے ضرور واقف ہو گا کہ یہ حضرات سلوک و تصوف کے صرف قائل اور عامل ہی نہیں بلکہ دین کے اس شعبہ کے خاص داعی اور علمبردار اور اصحاب سلاسل ائمہ ہیں اور اپنی تعلیم و تربیت اور اپنے تعامل میں ان حضرات نے تصوف کو خاص اور غیر معمولی اہمیت دی ہے اور جو لوگ اس سے بے بہرہ ہوں ان کو "دین کے مغز سے بے نصیب" تک لکھا ہے۔ پس ایک طرف ان کو مجدد (یعنی اپنے اپنے وقت میں نبوت و رسالت کی بدرجۂ اختصاص نیابت کرنے والا) ماننا اور دوسری طرف زندگی کے ان کے سب سے نمایاں پہلو اور ان کے عمر بھر کے طرزِ عمل کو "ضلالِ مبین" قرار دینا اور جو لوگ اس چودھویں صدی میں گذشتہ صدیوں کے ان ائمہ اور مجددین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوں ان کے طریقہ پر اصلاح و تزکیۂ نفس کی کوشش کو صحیح سمجھتے ہوں، ان پر خانقاہیت اور "پیری مریدی" کی پھبتیاں کسنا! اسکے سوا کیا عرض کیا جائے کہ دینی ذمہ داریوں کے عدمِ احساس کے علاوہ علمی سنجیدگی کے مقام سے بھی گری ہوئی بات ہے۔

یہ چھوٹی سی کتاب جو دراصل چند مقالات کا مجموعہ ہے، اسکی اشاعت سے ہماری خاص غرض اور امید یہی ہے کہ دین کے اس تکمیلی شعبہ کی جو واقعی نوعیت اور افادیت ہے اور دین میں اس کا جو حقیقی مقام ہے، اللہ کے باتوفیق بندے اس سے واقف ہو کر اس خیرِ کثیر اور اس دولتِ عظمیٰ کو حاصل کریں جو اس راستہ سے

حاصل کی جا سکتی ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا نے حاصل کی ہے اور اس کے بارے میں آج کل کے اکثر ذہنوں میں جو شکوک و شبہات اور الجھنیں حقیقت ناشناسی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، وہ صاف ہوں۔

اس میں شروع کے تین مقالے خود اس عاجز راقم سطور کے ہیں، اسکے بعد تین ہی مقالے ہمارے محترم دوست مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی کے ہیں۔ اس کے بعد ایک مقالہ "اہلِ تصوف اور دینی جد و جہد" رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ آخری آٹھواں مقالہ اسی عاجز کا ہے۔

کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اور کچھ طویل اور ضخیم بھی نہیں ہے۔ بس خود پڑھیئے اور لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے براہِ راست واقفیت حاصل کیجئے اور اگر باتیں صحیح اور اچھی معلوم ہوں تو اُن سے فائدہ اُٹھائیے اور لکھنے والوں کے لیے دُعائے خیر کیجئے۔

محمد منظور نعمانی عفی اللہ عنہ

ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ

طبع ثانی کے لیے نظر ثانی کی تاریخ ۵ر شعبان ۱۳۹۱ھ

(۱)

تصوّف پر ابتدائی غور اور تجربہ

(از محمد منظور نعمانی)

۱۳۶۱ھ کے اواخر یا ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی، جہاں دل و دماغ افکار و مکروہات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کے لیے میری نظرِ انتخاب اس زمانے کے ایک صاحبِ ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے۔ اور منظر بھی سرسبز و شاداب ہے۔ بہرحال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھا، ازراہِ شفقت و کرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا۔ یاد آتا ہے کوئی تیسرا شخص اُس وقت وہاں نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی سہ دری میں چند ذاکر "نفی اثبات" کا اور بعض اُن میں سے "اسمِ ذات" کا ذکر کر رہے تھے سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور مشائخ سلوک کے

تجویز کئے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔ اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اُس وقت میرے لیے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابلِ برداشت تھا، چنانچہ مجھ سے نہ رہا گیا اور مَیں نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا :۔

"حضرت! ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے اُس سے یہ سمجھا ہُوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جس کی تعلیم آپؐ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کو دی اور پھر صحابۂ کرامؓ سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل و روایت کے ذریعے جو اُن سے ہم تک پہنچا۔

اور یہ حضراتِ ذاکرین جس طرح جہری اور ضربی ذکر کر رہے ہیں، جہاں تک اپنا علم ہے، نہ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرامؓ کو یہ تعلیم فرمایا تھا۔ نہ صحابہ کرامؓ نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو ہی یہ طریقہ بتلایا تھا۔ اس لیے ذکر کے اس طریقے کے بارے میں مجھے خلجان ہے اور مَیں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ خلجان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اسکی تصحیح ہو جائے"

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا :۔

"مولوی صاحب! یہ بے چارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں، یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے۔ بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لیے میں اُن کو یہی بتلادیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں (یعنے تقریر و تحریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں "

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا۔ لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے کی مہلت دیئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور اُن کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرمادیا جو میرے لیے بھی دلچسپ تھا۔ اُن کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اُٹھانا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور عشاء کے قریب یہ مجلس ختم ہوگئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہُوا کہ ذاکرین نے اُسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کیا۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا۔ لیکن آج بھی اُن بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرما دیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

اُن بزرگ کے اس رویّہ سے الحمدللہ مَیں اس غلط فہمی میں مُبتلا نہیں ہُوا کہ چُونکہ میرے سوال کا کوئی جواب ان کے پاس ہے نہیں، اس لیے یہ اس سے پہلوتہی کر رہے ہیں، بلکہ مجھے یہ خیال ہُوا کہ غالبًا میرے سوال کو ایک اہل اور طالبِ صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے۔ بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے[1] اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیّت کچھ اور ہی تھی۔

خانقاہ کے جس حُجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نمازِ عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر مَیں اُس میں جا کر لیٹ گیا اور تصوّف کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر بطورِ خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں خود ہی سائل تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی۔ مَیں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی

---

[1] صُوفیوں کو اُنکے ایک بڑے اُستاد (حافظ شیرازیؒ) کا مشورہ بھی یہی ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی
بگذارید تا بمیرد در رنجِ خود پرستی

ہے تو اُس کی تصحیح ہو جائے اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو پھر اس بارے میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کروں اور ان باتوں کے غلط باطل ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کئے ہوئے ہیں اور اپنی قیود و ضوابط کے ساتھ سُنّت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے اُن کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر و شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے اُن کی کتابوں کے پڑھنے والے اور حالات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دُوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلدی ہی کر لیا کہ

مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے، بہ نسبت اس کے کہ امام ربّانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ و شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے۔ اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اسکے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لیے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے شخصی حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں اسرارِ دین کے عارف اور اُمت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے۔ بے شک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحبِ وحی تو نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروّج بھی نہیں ہو سکتا۔ خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو اور وہ اس کا خاص داعی ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو۔ اس میں اگر وہ بدعت وغیرہ میں امتیاز نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہوگا۔

بہرحال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے اس غور و فکر کا سلسلہ اُس وقت ختم کر کے سو جانے کا ارادہ کر لیا اور سو گیا۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصّہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نمازِ فجر کے بعد چند میل ٹہلتے ہیں۔ اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہو لیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث و مباحثہ اور اُس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا :-

"میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوّف کے ان اعمال و اشغال کے بارے میں جو اب تک میں نے سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔"

موصوف میری یہ بات سُن کر مسکرائے اور فرمایا :

"مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں ؟ یہ بتلایئے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے ؟"

میں نے عرض کیا :-

"بدعت کی تعریف تو علماء کرام نے کئی طرح سے کی ہے، لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لیے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔"

فرمایا :-

"ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ بتلائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو، جس طریقے سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ "دین میں اضافہ" اور "بدعت" کہیں گے ؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے فرمایا) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے۔ اور دین میں اس کا نہایت ہی تاکیدی حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے زمانہ میں اس کے لیے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لیے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ نہ مدرسے تھے، نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس

مقصد کے لیے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی، تو اللہ تعالےٰ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم و تعلّم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے۔ تو کیا تعلیم و تعلّم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی "دین میں اضافہ" اور بدعت کہا جائے گا ؟"

مَیں نے عرض کیا :۔

"نہیں ! "دین میں اضافہ" جب ہوتا ہے، جبکہ مقصود اور امرِ شرعی بتا کر کیا جائے ۔ لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدیم طریقے کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو "دین میں اضافہ" نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہو گا "۔

فرمایا :۔

"بس سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شُبہ ہے، اُن سب کی نوعیت بھی یہی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لیے کرایا جاتا ہے، جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالےٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اُس کی رضا کا دھیان، فکر رہنا اور اس کی طرف سے

کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن و حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔ [1]

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دین کے لیے تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضورؐ کے فیضانِ صحبت سے صحابہ کرام کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی۔ لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لیے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لیے صحبت کے ساتھ "ذکر و فکر کی کثرت" کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے اُن کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لیے اُن کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کیے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے

---

[1] کتاب و سنت کے جن نصوص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اُن میں سے چند آئندہ اوراق میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔ ۱۲

کے لیے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لیے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے، تو اُن میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی لیے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانے کے حالات اور اپنے اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں ردّ و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لیے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کر دیتا ہے اور بعضے ایسی اعلےٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کا کوئی ذکر شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالےٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کیا کرایا جاتا ہے۔"

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دور ہو گیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو خود آزما کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربے سے قلبی اطمینان اور مزید یقین حاصل

کیا جائے۔ لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کے لیے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں۔ اس لیے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا :-

"اگر یہ ذکر شغل ان مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر تو میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے۔ اُن کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

فرمایا :-

"مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے اور جان پڑتی ہے لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے، جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ بھی وہ ادھر دے دیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے، باوا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سوواں اور

ہزارواں حصّہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سک رہی ہیں) اُس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوّف کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اب صُورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بے چارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہی ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں۔ ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کرسکتا۔"

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا :-

"خدا معلوم لوگ تصوّف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوّف تو بس صرف اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہوسکتا ہے، وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا، تو دراصل تصوّف ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مُبارک ہے، وہ اسی راستے سے حاصل کرلے اور ہم کو بھی بتلادے، ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں

صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں
سینکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور
صاحبِ الہام بھی تھے۔"

مَیں نے عرض کیا :-

"جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہُوا ہو اور وہ یہ
محسوس کرتا ہو کہ اُسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے تو
کیا وہ کسی مُدّت تک اُس کام کو چھوڑ کے پہلے اس کی تحصیل
کرے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اُس کو بھی
کرتا رہے اور اُس کے ساتھ اس کو بھی حاصل کرنے کی
کوشش کرے؟"

فرمایا :-

"ہاں! ہو سکتا ہے، البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں
کچھ مُدّت کے لیے یکسوئی کے ساتھ اسی طرف مشغول ہونے کی
ضرورت ہوتی ہے۔"

مَیں نے عرض کیا :-

"کیا اس کے لیے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟"

فرمایا :-

"نہیں! بالکل نہیں! ہاں طلب اور اعتماد کے ساتھ محبت
اور صحبت ضروری ہے، بیعت تو صرف تعلق اور اعتماد کے اظہار

کے لیے ہے، ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص
دخل نہیں ہے "

میں نے عرض کیا :-

"پھر مجھ کو بھی کچھ فرما دیں "

فرمایا :-

"مولوی صاحب! حدیث میں ہے "المستشار مؤتمن"
(جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اُس کو پوری دیانتداری
سے مشورہ دینا چاہیئے) میں آپ کے لیے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ
آپ اس مقصد کے لیے فلاں صاحب یا فلاں صاحب کی
طرف رجوع کریں، ان حضرات پر اللہ تعالے کا خاص فضل ہے
اور آپ جیسے علم والوں کے لیے میں اُن ہی حضرات کو اہل
سمجھتا ہوں "

میں نے عرض کیا :

"ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی اور
اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہو گئی ہے، لیکن
چونکہ مجھ میں یہ طلب نہیں پیدا ہوئی ہے اس لیئے میں تو اس
راستے میں حضرت ہی سے راہنمائی حاصل کرنا اپنے لیے بہتر
سمجھتا ہوں "

موصوف نے اپنی محبت وشفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو

دفعہ پھر انہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمالیا اور میری معروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرما دیا۔ اور میں نے کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد میں غالباً چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا۔ جب اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا :۔

"حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاسؒ) کی خدمت میں آپ ضرور جایا کریں اور کچھ قیام کیا کریں "

اس موقع پر مولانا موصوفؒ کے متعلق بہت بلند چند کلمات بھی ارشاد فرمائے اور یہ حقیقت ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورے کی تعمیل پر آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحومؒ کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوفؒ کی شخصیت کو کچھ جانا اور کچھ عرصے کے بعد میں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہلِ خانقاہ سے مجھے جو بُعد تھا اُس میں اچھا خاصا دخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کا فکر اور اُس کی خدمت کا جوش میں کم پاتا تھا، حالانکہ میں اُسکو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاص میراث سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ

ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر اس کی اصلاح و تعدیل کے لیے ہی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی، گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحبِ اخلاص بندے سے دین کے درد اور اس راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں ؎

اے مرغِ سحر عشق زِ پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

آٹھ نو برس پہلے کا واقعہ ہے، حافظہ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا لکھ دیا ہے، اپنی اور اُن بزرگ کی گفتگو کا جو حصّہ نقل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ان سب کو روایت بالمعنی ہی میں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی بعض باتیں رہ گئی ہوں اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں اُن بزرگ سے سُنی گئی ہوں۔ بہر حال جو توضیحات و تشریحات اُن بزرگ کی طرف منسوب کر کے یہاں لکھی گئی ہیں اس کا اطمینان ہے کہ وہ سب اُنہی کی ہیں۔

تصوف کے اعمال و اشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا گیا تھا، افسوس ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لااُبالی پن سے وجہ سے اور کچھ اپنے دیگر

مشاغل کی کثرت اور خاص نوعیت کے سبب سے کماحقہ وہ تجربہ تو نہیں کیا جاسکا، تاہم جو ٹوٹا پھوٹا اور برائے نام سا تعلق اس سلسلے سے اور اس کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا اور اس کی وجہ سے اس راہ کے بعض اکابر سے جو قرب حاصل رہا اور اُن کے احوال اور ماحول کو قریب سے مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا اُس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوّف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہلِ تصوّف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں ۔

خدالگتی بات یہ ہے کہ غریب "تصوّف" اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی، لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں، کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں ۔

(۲)

تصوّف اور اس کے اعمال واشغال کے متعلّق میرے چند یقین

(۱) تصوّف کا مقصد اور اُس کی حقیقت | الحمد للہ کہ اب اس باب میں کسی طرح کا کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ تصوّف اور اُس کے اعمال واشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات اور ملکات کی تحصیل کے سِوا کچھ نہیں ہے جن کو کتاب و سنت ہی میں کمالِ ایمان و اسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ اس بارے میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں، اس لیے جو کچھ اس سلسلہ میں مَیں نے سمجھا ہے اس کو ذرا تفصیل سے عرض کرتا ہوں وباللہ التوفیق۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کے لیے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً محبت کے بارے میں سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں ارشاد ہے :-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ـ
(سورہ بقرہ ـ ۲۰ ع)

اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے ۔

اور حدیث صحیح میں ہے ۔

ثلث من کن فیه وجد حلاوۃ الایمان ، الحدیث ۔

(یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں ۔ اُن میں سے اول یہ کہ اللہ و رسول کی محبت اُس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو ۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اُس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے واسطے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اُس کے لیے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا ۔)

اور سورۂ انفال کے پہلے رکوع میں ہے :-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ
(سورۂ الانفال ـ ع ۱)

"سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا یہ حال ہے کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو اور جب اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نورِ ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں ۔"

اور سورۂ مومنون میں اللہ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ۝

(المومنون - ع - ۴)

"بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی ہیبت سے خوفزدہ رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں اور وہ جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک کاموں میں) انکے دل خائف رہتے ہیں کہ انکو اللہ کے حضور میں لوٹ کے جانا ہے (معلوم انکے یہ عمل قبول ہوں یا نہ ہوں) وہی لوگ بھلائیوں کی طرف تیزگامی کرتے ہیں اور وہی ان کے لیے دوڑ کر بڑھنے والے ہیں"

اور سورۂ زمر میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ۔

(زمر - ع - ۳)

"اس سے ان لوگوں کے بدن کانپنے لگتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور پھر ان کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے"

اور سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے :-

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ ۔

وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو ہر وقت اور ہر حالت میں یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں کھڑے

(آل عمران) بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔"

اور سورۂ "مزمل" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے :-

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ (مزمل) "اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہو کر اسی کی طرف متوجہ رہو۔

ان آیتوں میں جن اوصاف و کیفیات کو اہلِ ایمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں :-

۱۔ ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

۲۔ اُن کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لرزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

۳۔ اُن کے سامنے جب آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نورِ ایمان میں اضافہ ہو۔

۴۔ اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

۵۔ وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوفزدہ رہتے ہوں۔

۶۔ اللہ کا خوف اُن پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی اُن کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابلِ قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

۷۔ قرآن مجید کی تلاوت یا اُس کی آیتیں سننے سے اُن کے جسم کانپ جاتے ہوں اور اُن کا ظاہر و باطن اللہ تعالےٰ کی طرف اور اُس کی یاد کی

طرف جھک جاتا ہو۔

۸۔ وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

۹۔ ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

اور قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال و کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :-

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان۔ (مشکوٰۃ شریف)	"جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لیے محبت کرے (جس سے محبت رکھے) اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کے لیے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا ہی کے لیے ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا"۔

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے :-

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (بخاری و مسلم) وفی روایۃ ان تخشی اللہ کانک ان	احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرو یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ

تعبد اللہ - تم اُس کو نہیں دیکھتے ہو، پر وہ تم کو ہر جگہ اور ہر آن دیکھتا ہے"۔ (فتح الباری)

پہلی حدیث میں "اخلاص" کا ذکر ہے اور دُوسری حدیث میں "احسان" کا اور یہ دونوں ان ہی احوال وکیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دین میں ان احوال وکیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ (صلعم) ان کے حصول اور ان میں ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کی یہ چند دُعائیں اس عاجز کے نزدیک خاص طور سے غور اور توجّہ کے لائق ہیں :-

اللّٰھم اجعل حبك احب الی من نفسی و اھلی و من الماء البارد -	اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال سے اور سخت پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اللّٰھم اجعل حبك احب الاشیاء الیّ کلھا وخشیتك اخوف الاشیاء عندی واقطع عنی حاجات الدنیا بالشوق الی لقاءك واذا اقررت اعین اھل الدنیا من دنیاھم	"اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ ہر قابل محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور ڈرنے کے قابل ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور اپنی ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کر دے کہ دُنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کٹ جائیں اور جب تو دنیا والوں کو انکی چاہتی دنیا دیکر اُن کی آنکھیں

فاقر رد عینی من عبادتک ۔	ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کر اور اپنی عبادت کے ذریعہ میرے دل میں سکون اور ٹھنڈک پیدا کر ۔"

اللّٰھم اجعلنی اخشاک کانی اراک ابداً حتی القاک ۔ الخ	"اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں ۔ یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا ملوں ۔"

اللّٰھم انی اسألک ایماناً یباشر قلبی و یقیناً صادقاً حتی اعلم انہ لا یصیبنی الا ما کتبت لی ورضا من المعیشۃ بما قسمت لی ۔	"اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئے گی جو تو نے میرے لیے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے دل کا حال ہو جائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گزارہ تو نے میرے لیے مقرر اور مقدر کر دیا ہے میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ سے مانگتا ہوں ۔"

اللّٰھم انی اسألک التوفیق لمحابک من الاعمال وصدق	اے اللہ جو اعمال تجھے پسند ہیں میں ان کی توفیق تجھ سے مانگتا ہوں اور تجھ پر توکل کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور

التوکل علیك وحسن ظن بك ۔

تیرے ساتھ حسن ظن کی تجھ سے ہی استدعا کرتا ہوں۔

اللھم انی اسالك نفساً بك مطمئنة تومن بلقائك وترضی لقضائك وتقنع بعطائك ۔

اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جسے تجھ ہی سے اطمینان اور انس حاصل ہو، جسے تیری ملاقات پر سچا ایمان اور یقین نصیب ہو جو تیری قضاء و قدر پر راضی ہو اور جو تیری دین پر قانع ہو۔

اللھم افتح مسامع قلبی لذکرك

اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کیلئے کھول دے۔

اللھم انی اسالك قلوبا اوّاھة مخبتة منیبة فی سبیلك ۔

اے اللہ! میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں جو نرم اور درد آشنا ہوں، ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے والے ہوں۔

اللھم اجعل وساوس قلبی خشیتك وذکرك واجعل ھمتی وھوای فیما تحب وترضی ۔

اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت اُن ہی چیزوں کی طرف ہو جو تجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔

اللھم اجعل فی قلبی نوراً واعطنی نوراً.....واجعلنی نوراً ۔

اے اللہ! میرے قلب میں نور بھر دے، اور مجھے نور عطا فرما دے..... اور مجھے سراپا نور بنا دے۔

یہ سب دُعائیں (اور اس قسم کی بیسیوں دُعائیں) کتبِ حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مروی ہیں۔ آپ خود بھی یہ دُعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دُعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے، وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں۔ مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف، اللہ سے شوقِ ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دُنیا کی ضروریات اور خواہشات فراموش یا فنا ہو جائیں۔ عبادت میں آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ تعالیٰ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقینِ صادق، رضا بالقضا، توکل علی اللہ، حُسنِ ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا اور اُس کی عطا پر قانع ہونا۔ ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا۔ اُس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جُھکا ہُوا ہونا۔ اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کا خوف، وساوس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے اور بندہ کا جی صرف اُنہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ نور سے قلب کا معمور ہو جانا۔

ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے، نہ اعمال کے باب سے بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں اُن کی اتنی اہمیت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

پس تصوّف دراصل اس قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور کثرتِ ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ ایسی جن کی تجربہ تصدیق کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والے لوگوں کے لیے اُن کی نفسیاتی اور عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں[1] ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی غالباً ناظرین کے لیے مفید ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات و احادیث اور دُعاؤں سے جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب و مقصود ہونا ابھی معلوم ہو چکا ہے۔ اُن میں سے چند مثلاً عشق اور یقین اور قلب کی رقت اور سوز و گداز یہ تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر اُن کے نتائج اور لوازم ہیں۔ اس لیے تصوّف کے ان اعمال و اشغال کے ذریعہ براہِ راست صرف ان بُنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ اصولی نظریہ جس پر تصوّف کی بُنیاد ہے اور جس کی بناء پر اس کو دین کا تکمیلی شعبہ بھی سمجھا جاتا ہے

یہ عاجز بلا کسی انکسار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا اُبالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چونکہ میں اس سلسلہ کے تجربہ کی طرف پُوری توجّہ

---

[1] عقلی توجیہ کے لیے "صراطِ مستقیم" (مرتبہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کے چند ابتدائی اوراق کا مطالعہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ کسی درجہ میں کافی ہو گا۔ ۱۲

نہیں دے سکا۔ اس لیے خود تو ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور برائے نام توجہ کی جا سکی اور اس راہ کے بعض اکابرین کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلے میں ملتی رہی اسی سے الحمد للہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ تصوّف اور اس کے اعمال و اشغال کی غرض و غایت اور اُن کی حقیقت کے متعلق اُن بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

---

(۲) اور دل و دماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تصوّف کے ذریعہ جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی حلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔

(۳) اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تصوّف ایمان و اسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی رُوح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر صلاحیت اور طبیعت کو مناسبت ہو تو یقین اور اعتماد، ہمّت و عزیمت، صبر و توکّل اور ماسوی اللہ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تصوّف کے ذریعے ان کو پیدا کیا جا سکتا ہے اور اُبھارا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تصوّف کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقے پر کسی بڑی اصلاحی تبدیلی کے لیے مصروفِ جدّ و جہد ہوں اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہیں۔

(۴) تصوف سے دُوری اور بے خبری کے دَور میں میری یہ رائے تھی کہ تصوف کا قالب ہم کو بدل دینا چاہیئے اور اُس کی رُوح کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نئے سانچے میں اُس کو ڈھال دینا چاہیئے۔ لیکن بعد میں جب تصوف اور اُس کے حاملین سے کچھ قرب پیدا ہُوا تو معلوم ہُوا کہ صُورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیلی کا عمل برابر جاری ہے اور خود ہماری اس صدی میں بھی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ وغیرہ نے اپنے تجربہ اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ تجدید و ترمیم کی ہے اور زمانۂ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور سائنٹیفک کر دیا ہے اور اب بھی یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلا شُبہ سلوک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہیئے۔ لیکن اس کا اب پُورا پُورا یقین ہو گیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس فن کے امام اور خود اس سمندر کے شناور ہوں، ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری میرے ایسے حضرات نے لے لی جنہوں نے نہ اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اُس کے ساتھ اُن کا گہرا عملی تعلق رہا ہے تو اس کا بڑا امکان ہے کہ اخلاص اور ذہانت کے باوجود تصوف میں ان کی اصلاح و ترمیم خدانخواستہ اسی قسم کی ہو جیسی کسی روایتی بڑھیا نے شاہی باز کی مرمت کی تھی۔

(۵) تصوف اور اہلِ تصوف سے قریب ہونے کے بعد جن چند باتوں کا یقین حاصل ہُوا۔ اُن میں سے ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا اور کیسا ہی ذہین فطین ہو۔ تصوف سے صحیح واقفیت حاصل کرنے اور اس کے مالہ و ماعلیہ کو علیٰ وجہ البصیرت جاننے کے لیے اس کو بھی اُس کی

ضرورت ہے کہ تصوّف کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گزرے اور اس شعبہ کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ زندگی کے کچھ دن صرف کرے، اس کے بغیر تصوّف کو پوری طرح سمجھا اور جانا نہیں جا سکتا۔

جن صاحبِ ارشاد بزرگ کی خانقاہ میں اپنی حاضری کا ذکر گزشتہ صفحات میں راقمِ سطور کر چکا ہے۔ ایک موقع پر میرے ہی ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں ادا فرمایا تھا :-

"گھر کے اندر کی چیزوں کا پورا علم تو گھر میں داخل ہو کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے"۔

الغرض تھوڑے سے ہی تجربے سے اربابِ تصوّف وسلوک کے اس مشہور مقولہ کی تصدیق حاصل ہو گئی کہ "من لم یذق لم یدر" یعنی "لذت ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی" کچھ دن ہوئے ایک بڑے اچھے ذی علم اور ذہین، صاحبِ قلم دوست کی ایک تحریر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا جس میں انہوں نے تصوّف پر اظہارِ خیال کر رہا تھا۔ کم از کم ناچیز کو تو ایسا کچھ محسوس ہوا کہ کوئی بڑا ذہین بچہ کسی ایسے موضوع پر اظہارِ خیال کر رہا ہے، جس کے مبادی سے بھی واقفیت حاصل کرنے کا اس کو موقع نہیں ملا ہے، مگر پھر بھی اُس کی ذہانت قابلِ داد ہے۔

(۶) تصوّف اور اُس کے بعض حلقوں کے اس چند روزہ ہی قرب وتعلق سے یہ بھی ہوا کہ جس طرح دین کے دوسرے شعبے کی طرف اچھی صلاحیتیں رکھنے والے افراد

فی زمانہ بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً دیکھا جا رہا ہے کہ علم دین کے طالبوں اور علیٰ ہذا دین کی دعوت و خدمت کی طرف توجہ کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد آج کل اُن ہی بے چاروں کی ہوتی ہے جو صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور پست درجہ کے ہوتے ہیں۔ بالکل یہی، بلکہ شاید دین کے دُوسرے شعبوں سے زیادہ افسوسناک اور ابتر حال اس لحاظ سے دین کے اس شعبہ (تصوّف) کا بھی ہے۔ اس وقت اُن "خانقاہوں" سے بحث نہیں، جو دراصل دھوکہ فریب کی دُکانیں ہیں اور جہاں اولیاء اللہ کے نام پر شرک و بدعت کا کاروبار ہوتا ہے اور نہ یہاں اُن نااہل موروثی سجادہ نشینوں اور پیشہ ور پیروں، صُوفیوں کا ذکر ہے جو تصوّف کے نام اور بزرگوں کی نسبت کی تجارت کرتے ہیں، بلکہ جو واقعی مشائخ حق اور صاحبِ ارشاد ہیں۔ اُن کے پاس بھی جو طالب بن کر اب آتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ (شاذو نادر مثالوں کو مستثنیٰ کرکے) دل و دماغ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بے چارے عموماً نیچی ہی سطح کے ہوتے ہیں اور اگرچہ اپنے اخلاص اور اپنی صادق طلب اور محنت سے ان میں سے بھی بہت سے اس شعبہ کی کچھ برکتیں ضرور حاصل کر لیتے ہیں، لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ بے چارے خانقاہی فیضان و تربیت کا ایسا نمونہ تو نہیں بن سکتے ہیں جن کا حال اور قال خانقاہیت کی بدنامی اور تصوّف و روحانیت بیزاری کے اس دور میں دین کے اس شعبہ کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرنے پر لوگوں کو مجبور کر دے۔

اصولی بات ہے کہ جو کام جتنا زیادہ بلند اور لطیف و نازک ہو اُس کے کرنیوالے بھی اُسی درجہ کے ہونے چاہئیں۔ موجودہ دور میں تصوّف کی ناکامی

اور بدنامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جو اسکے اہل ہیں وہ توجہ نہیں کرتے۔ اور جو بے چارے توجہ کرتے ہیں عموماً ان کی صلاحیتیں معمولی ہوتی ہیں لیکن دُنیا اُن ہی کو پھل سمجھ کر اصل درخت کے متعلق رائے قائم کرتی ہے۔

(۷) اس موقع پر ایک چیز خود مشائخِ کرام کے متعلق بھی ناظرین سے بے تکلف عرض کرنا ضروری ہے:۔

جس طرح دُنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کامیاب وکیل ہو، وہ اچھا ڈاکٹر بھی ہو اور جو بالغ النظر فلسفی ہو وہ سیاسیات یا معاشیات کا ماہر بھی ہو اور جو ماہر فن انجنیئر ہو وہ اچھا ادیب اور شاعر بھی ہو۔ بعینہٖ یہی حال دین کے مختلف شعبوں کا بھی ہے، بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو شخص وسیع النظر عالم اور بلند پایہ محدّث یا فقیہ ہو وہ تصوّف میں بھی خاص دستگاہ رکھتا ہو یا جو صاحبِ قلب صُوفی اور عارف ہو۔ وہ اسلامی قانون کا ماہر بھی ہو اور عہدِ حاضر کے اہم مسائل کے بارہ میں دینی نقطۂ نظر سے صحیح رائے قائم کرنے والی مجتہدانہ فکر و بصیرت بھی رکھتا ہو۔ بلکہ حقائق اور واقعات کی اس دنیا میں پہلے بھی اکثر ایسا ہی ہوا ہے اور ہمارے اس زمانہ میں تو تقریباً ۹۰۰۹ فیصد ایسا ہی ہے کہ جو کسی ایک شعبہ میں ماہر اور کامل ہوتا ہے وہ دوسرے شعبوں میں اکثر خام ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس زمانہ میں ایسے لوگ اکثر مایوس اور محروم ہی رہتے ہیں جو صرف کسی ایسے ہی شخص سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں جو اُن کے مفروضہ معیار کے مطابق ہر جہت سے کامل مکمل ہو۔

یاد آتا ہے راقم سطور نے اپنے ایک محترم دوست سے اس موضوع پر

گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ عرض کیا تھا :-

"آپ ماضی اور حال کے متعدد ایسے حضرات سے یقیناً واقف ہیں جن کی زندگی آپ کی نظر میں دین اور تقویٰ کا کوئی اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں ہے اور بالخصوص اخلاص واحسان اور توکل وتسلیم جیسی اعلیٰ ایمانی صفات وکیفیات میں آپ کے نزدیک ان حضرات کا کوئی بھی خاص یا عام مقام نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اُن کا علم وفکر اور ان کی خداداد ذہانت اور بصیرت آپ کے خیال میں قابلِ استفادہ ہے اور ہم آپ ان کی چیزوں سے برابر استفادہ کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو صرف اُن کے علمی اور تحقیقی کوششوں سے اس لیے فائدہ نہیں اُٹھاتے کہ وہ اُن کی نیک خواہش کے مطابق کوئی بڑے بزرگ اور صوفی قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم اللہ کے کچھ بندوں کو ایسا پاتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں تصوف اور سلوک پر زیادہ توجّہ دی اور کسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا بڑا حصّہ اس شعبہ کی تحصیل اور تکمیل پر صرف کیا اور اس لیے اس میں انھیں اختصاص اور امتیاز کا مقام حاصل ہو گیا۔ لیکن کسی دوسرے شعبے میں مثلاً علم وفکر ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں کوئی خاص بلندی حاصل نہیں ہے اور اس لیے دین کی بعض ضرورتوں کو جن کو ہم بہت اہم سمجھتے ہیں،

وہ اچھی طرح محسوس بھی نہیں کرتے اور ملت کے مشکل اور اہم اجتماعی
مسائل میں وہ بہتر رہنمائی نہیں کر سکتے یا فرض کیجئے کہ مطالعہ یا غور و توجہ
کی کمی کی وجہ سے وہ وقت کے بہت سے اہم معاملات کو صحیح طور پر
سمجھتے بھی نہیں تو ان حامیوں کو دیکھ کر اُن کے اس کمال کی بھی نفی کرنا
جو واقع میں اُن کو حاصل ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود اس شعبہ میں
بھی اُن سے ہمارا استفادہ نہ کرنا اُن ہی لوگوں کی جیسی عامیانہ غلطی ہے
جن کو تنگ نظری اور تاریک خیالی کا مریض سمجھا جاتا ہے ''

اس میں شک نہیں کہ جی تو اپنا بھی یہی چاہتا ہے اور ہر اچھا بھلا آدمی یہی چاہے گا کہ جو شیخِ خانقاہ اور عارفِ حق آگاہ ہو وہ بلند پایہ مفسّر و محدّث اور بالغ النظر فقیہ و مجتہد بھی ہو، بلکہ ساتھ ہی ملّت کی قیادت اور امامتِ کبریٰ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھی پوری صلاحیتیں رکھتا ہو اور اسی طرح جو اچھی نظر و فکر رکھنے والا عالمِ دین ہو وہ اسلامی شریعت و قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ اُمّت کی قیادت اور حکومت کے نظام کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو اور مزید براں اپنے قلب و باطن کے لحاظ سے اپنے دَور کا جنید و بایزید بھی ہو۔ لیکن یہ تو صرف ہمارے جی کی چاہت اور ایک خوشگوار تمنّا ہوئی۔ اور یہ دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ خیالات اور تمنّاؤں کی دُنیا نہیں ہے۔ بلکہ حقائق و واقعات کی دُنیا ہے اور عملی آدمی کو اپنا طرزِ عمل واقعات ہی کی اس دُنیا کو سامنے رکھ کر متعین کرنا چاہیئے۔

جن صاحبِ خانقاہ بزرگ کی خدمت میں اپنی حاضری کا ذکر راقم سطور نے

گزشتہ صفحات میں کیا ہے، اُن ہی کی زبان سے کئی بار یہ حکیمانہ ارشاد سُنا ہے :۔

"یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی دُکان پر سب سودے اچھے مل سکیں، اس لیے جو سودا جس دُکان پر اچھا ملے اُس کے لیے آدمی کو اُسی دُکان پر جانا چاہیئے "

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اُس میں راقم کا رُوئے سخن تصوّف کے مخلص ناقدین اور منکرین کی طرف تھا۔ اب اپنے تجربہ ہی کے چند نتیجے اور چند تاثرات تصوّف کے حاملوں اور حامیوں سے بھی عرض کرتے ہیں۔

(۸) تصوّف کے مقصد اور اس کی حیثیت کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا ہے اگرچہ خود اپنے کو بحمد اللہ اس میں شک نہیں رہا ہے کہ اصلیت وہی ہے، لیکن بعض مشائخ حق اور اُن کی خانقاہوں سے طلب اور عقیدت کا تعلق رکھنے والوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہوتا اور وہ طرح طرح کی غلط خیالیوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تصوّف کے جن اعمال و اشغال کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض کیفیات پیدا کرنے کا وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ خانقاہی حلقوں میں بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں، جو ان اعمال و اشغال ہی کو گویا اصل سلوک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و اشغال اذکار کے بعض وہ آثار جن کے متعلق تمام مشائخ محققین یہ فرماتے ہیں:۔

"ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح کے اوہام و خیالات ہیں "

تصوّف کے ہمارے حلقوں میں تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات ان ہی کی

طلب میں اُلجھے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی غلطیاں اور اُلجھنیں ہیں جن میں خانقاہی طالبین بکثرت مُبتلا ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگ ذہنوں کی صفائی کی طرف پُوری توجّہ نہیں فرماتے، حالانکہ یہ بڑے اہم درجے کی ضرورت ہے اور اس ناچیز کا خیال ہے کہ سلوک و طریقت کے جن حلقوں میں پہلے کبھی گمراہیوں نے جگہ پائی ہے، وہ بعض ایسے بزرگوں کی اسی قسم کی بے توجہی کا نتیجہ ہے، جو خود ہمارے نزدیک ان گمراہیوں میں مُبتلا نہ تھے۔ تصوّف کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ مشائخ اگر پوری طرح چوکنّے نہ رہیں اور اپنے طالبین اور معتقدین کے ذہنوں کی صفائی اور خیالات کی اصلاح کی فکر نہ رکھیں تو شیطان کی گمراہ کرنے والی کوششیں اس حلقے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو سکتی ہیں۔ بہرحال ہمارے بزرگوں کو اس خطرے سے غفلت نہیں برتنی چاہیے اور اذہان و خیالات کی صفائی اور اصلاح کو ذکر و شغل سے بھی مقدم سمجھنا چاہیئے۔

(۹) ائمہ تصوّف امام ربّانی اور حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس پر بڑا زور دیا ہے کہ طالب کو پہلے ضروری عقائد کی تصحیح اور بقدرِ ضرورت علمِ دین حاصل کرنا چاہیئے اور اس کو شیخ کے فرائض میں گردانا ہے کہ وہ اگر طالب اور مرید میں یہ کمی دیکھے تو اُس کو اس طرف متوجّہ کرے لیکن بعض مشائخ کے یہاں اس ذمّہ داری کا احساس اور اس کے عملی اہتمام میں بہت کمی دیکھنے میں آئی۔ بہت سے بیچارے سیدھے سادے ایسے بندے ان کی خدمت میں بیعت کے لیے آتے ہیں جن کی باتوں سے اور جن کے ظاہری حال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان بے چاروں کو دین کی وہ ضروری اور بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں جو ہر مُسلمان کو معلوم ہونا

چاہئیں اور بہت واضح اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غالباً ان کو صحیح نماز پڑھنا بھی نہ آتا ہوگا۔ لیکن کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ ایسوں کو بھی مشائخ کے عام طریقے پر تجدید ایمان اور توبہ کرا کے بس بیعت کر لیا گیا اور پڑھنے کے لیے کوئی تسبیح اُن کو بتادی گئی اور بقدرِ ضرورت دین سیکھنے کی طرف نہ کوئی توجہ دلائی گئی اور نہ اس کا کوئی انتظام فرمایا گیا۔ حالانکہ ان حضرات کے لیے یہ بہت آسان ہے کہ ایسے جو لوگ بھی اُن کے پاس آئیں اُن کو دو چار دن کے لیے روک کر اُن کی ضروری تعلیم (عقائد اور نماز کی تصحیح وغیرہ) کسی خادم کے سپرد کر دی جائے۔ جیسا کہ نئے آنے والوں کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دستور تھا۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں کی اس بے توجہی کا سبب یہ ہو کہ ان آنیوالوں کی اس درجہ جہالت اور دین کی بنیادی چیزوں سے بھی اتنی ناواقفیت کا ان حضرات کو اندازہ نہ ہوتا ہو، لیکن عرض یہی کرنا ہے کہ اس طرف ان حضرات کی توجہ کا مبذول نہ ہونا اور اس پہلو پر نظر نہ کرنا۔ ان کے ذمہ دارانہ منصب کے شایانِ شان نہیں۔

(۱۰) تصوف کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے اُن سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مختلف زمانوں میں اس راہ سے کیسی کیسی گمراہیاں اُمت میں داخل ہوئی ہیں اور آج بھی اپنے کو تصوف و صوفیاء کی طرف منسوب کرنیوالوں میں کتنی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے تصورات اور اعمال، اسلام اور توحید کی نسبت کفر اور شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ نے جنہیں واقفیت اور بصیرت دی ہے وہ جانتے ہیں کہ خانقاہی حلقوں میں اس قسم کی گمراہیاں زیادہ تر بزرگوں کے ساتھ عقیدت

اور خوش اعتقادی میں غلو اور تعظیم میں افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے شریعت و سُنّت کے حامل اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے مشائخ حق کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ وہ اپنے سے تعلّق و محبّت رکھنے والوں کو اعتقادی اور عملی غلو اور افراط کی اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی طرف ہمیشہ پوری بیداری کے ساتھ متوجہ رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں۔ رسول اللہ صلعم کا اسوۂ حسنہ ہمارے بزرگوں کے سامنے رہنا چاہیئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی کی زبان سے نکل گیا "ماشاء اللہ وشئت" (یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) حضورؐ نے اُن کو سخت تنبیہ کی، اور فرمایا:-

جعلتنی للہ نداً بل ماشاء اللہ وحدہ۔	"تو نے مجھے اللہ کے برابر بنادیا، بلکہ یہ کہو کہ "جو تنہا خدا چاہے"۔

ایسے ہی ایک اور موقع پر بعض صحابہ کو تنبیہ کرتے ہوئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:-

لایستھوینکم الشیطان انا محمد بن عبد اللہ عبد اللہ ورسولہ ما احب ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنی اللہ۔	"لوگو! تمہیں شیطان گمراہ نہ کرے اور تم اُس کے بہکانے بہک نہ جاؤ میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں۔ اللہ کا بندہ اور بس اُس کا رسول ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس درجے سے اُوپر اُٹھاؤ جہاں خدا نے مجھے رکھا ہے"۔

اس بارے میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر کتنی باریک بین تھی اور کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو صحاح میں مروی ہے، کہ

جس روز آپؐ کے صاحبزادے "ابراہیم" (علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات ہوئی۔ اتفاق سے اُسی روز سورج کو گہن لگ گیا اور آپ کو شبہ ہوا کہ لوگ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ سورج کو یہ گہن بیتِ نبویؐ کے اس حادثہ کی وجہ سے لگا ہے، تو آپؐ نے اُسی وقت اعلان کرا کے لوگوں کو مسجد میں جمع کرایا اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد اعلان فرمایا :-

ان الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ لا ینکسفان لموت احد ولا لحیاتہ ۔ الخ

" چاند اور سورج اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے اُن کو گہن نہیں لگتا (بلکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حساب کے مطابق اور اُس کے حکم سے ایسا ہوتا ہے)۔ الخ

چونکہ اُمت کے تمام طبقوں میں صرف مشائخ ہی کا طبقہ ایسا ہے جس کے ساتھ عقیدت میں لوگوں کو اس قسم کا غلو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، اس لیے ان حضرات کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ اس بارے میں اپنی ذمہ داری اور مسئولیت ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں ۔

(۳)

تصوّف اور اُس کے اعمال و اشغال کے مُتعلّق بعض شُبہات

"یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے جب "الفرقان" کے صفحات میں یہ شائع ہُوا تو بعض دوستوں کی طرف سے کچھ سوالات اس سلسلہ میں کئے گئے اور الفرقان ہی میں اس عاجز نے اُن کے جوابات دیئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن جوابات کو بھی اس کتابچہ کا جزو بنا دیا جائے" (مؤلف)

۱۔ ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے :-

"تصوف کی جو اہمیت آپ کے اس مقالہ سے ظاہر ہوتی ہے اگر واقعۃً اس کی اتنی ہی اہمیت ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق اور اس کے اعمال واشغال سے متعلق صریح احکام کیوں نہیں دیئے؟ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں

آتی کہ کوئی چیز دین میں اس قدر ضروری ہو کہ ایمان و
اسلام کی تکمیل اُس پر موقوف ہو اور رسول اللہ (صلی اللہ
علیہ وسلم) نے اُمت کو اس کی تعلیم نہ دی ہو"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب نے میرے مقالہ کو بالکل غور سے نہیں پڑھا
میں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا تو حال ہی یہ ہے کہ تصوّف کا جو مقصود ہے
اور جو اس کی غایت اور غرض ہے (یعنی اللہ کی محبت و خشیت اور یقین و استحضار
اور اخلاص و احسان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) سو اس کی تو دین میں اہمیت
ہے اور یقیناً ایمان و اسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اُمت کو اس کی
تعلیم اور ترغیب بھی دی ہے۔ کتاب و سُنّت کے جو نصوص اس سلسلہ میں پہلے
لکھے جا چکے ہیں، وہ اس کے ثبوت کے لیے کافی سے زائد ہیں۔ رہے اس کے
خاص اعمال و اشغال (مثلاً اذکار و مراقبات وغیرہ) تو میں یہ صراحت سے
لکھ چکا ہوں کہ یہ اس کے صرف وسائل اور ذرائع ہیں اور اس قسم کے ذرائع
اور وسائل کے متعلق نبویؐ طریقِ تعلیم اور اصولِ تشریع کا تقاضا یہی ہے کہ ان
کی تصریح اور تعیین نہ کی جائے، تاکہ ہر زمانہ کے حالات کے مطابق جو جائز
ذرائع اور وسائل مناسب سمجھے جائیں اُنہیں اختیار کیا جاسکے اور اُس میں تصوّف
کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ دین کے دُوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے۔

غور فرمایا جائے دین کا سیکھنا سکھانا دین کے بُنیادی فرائض میں ہے،
لیکن کتاب و سنت میں اس کے طریقے کی بھی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت اُمت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا کہ تم اس کے لیے فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہدِ صدیقی رض میں یمامہ کی جنگ میں چار سو حافظِ قرآن صحابہؓ شہید ہوگئے، تو سب سے پہلے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو یہ خیال ہُوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا بھی انتظام کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں خاص اہتمام اور ذمہ داری سے ایک سرکاری نسخہ بھی تیار ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی یہ تجویز حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے سامنے پیش کی۔ حضرت صدیق رض کو ابتداءً اس کے ماننے میں تامل ہُوا اور انہوں نے یہی فرمایا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو خود کیا اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا۔ اس کو ہم کیوں کریں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دلائل سے بالآخر وہ مطمئن ہوگئے اور پھر اُن ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں ایک اور قدم اُٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کرا کر تمام بلادِ اسلامیہ میں روانہ کیں اور اُس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت و اشاعت، تعلیم و تبلیغ اور ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں خدمتِ قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اُٹھائے جا چکے ہیں۔

پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو اُس کے ذرائع اور وسائل کی تفریح

اور تعیین بھی کتاب و سُنّت میں ہونی چاہیئے اور اُمت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعیین کے ساتھ کتاب وسنت میں ملنی چاہیئں۔ بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء علیہم السّلام کے طریق تعلیم اور اصولِ تشریع سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ایک صاحب نے دریافت کیا ہے کہ :۔

"اللہ تعالےٰ کی محبت وخشیت اور اخلاص و احسان وغیرہ ایمانی کیفیات پیدا کرنے کے لیے تصوف میں جن اعمال و اشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور اذکار و مراقبات وغیرہ) پر زور دیا جاتا ہے، کیا کتاب وسنّت میں کہیں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ ان چیزوں سے یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں؟"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ اس عاجز کے نزدیک صحبت اور ذکر و فکر کا قلب پر اثر انداز ہونا کتاب و سُنّت سے اشارۃً ہی نہیں بلکہ صراحۃً بھی معلوم اور ثابت[1] ہے، لیکن اگر بالفرض کتاب و سُنت میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہ ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی

---

[1] حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ صحابی اور حضرت صدیق اکبرؓ اپنا حال یہ بتلاتے تھے کہ

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اللہ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں کہ ان اعمالِ صالح سے یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت کو ہمیں مان لینا چاہیئے۔

میرے جن دوست نے یہ سوال کیا ہے وہ "صالح لٹریچر" کے ذریعہ اصلاح پر بہت یقین رکھتے ہیں (مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے) لیکن وہ سوچیں، کیا کبھی اُنکے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اُن کے "صالح لٹریچر" کی اس تاثیر کے متعلق کوئی اشارہ کتاب و سُنت میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ اُن کے دل میں کبھی بھی یہ سوال پیدا نہ ہُوا ہوگا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی علم و تجربے سے اور اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے تجربے سے اس بارہ میں مطمئن ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اپنی چیزوں اور اپنے تجربوں کے

(بقیہ حاشیہ ص۵۴ سے)

جب تک حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت اور مجلس میں رہتے دل کی یہ کیفیت رہتی کہ ایک لمحہ کیلئے غفلت نہ ہوتی اور غیب گویا مشاہدہ ہو جاتا لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے یہ کیفیت نہ رہتی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قبر میں دفن کر کے ہم مٹی سے ہاتھ جھاڑتے ہی تھے کہ ہمیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے، یعنی حضورؐ کے اس عالم سے عالمِ برزخ میں منتقل ہو جانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں فرق محسوس پڑا۔ ان دونوں روایتوں سے صحبت کا قلبی کیفیات میں مؤثر ہونا صاف طور سے معلوم ہوتا ہے اور ذکر کی تاثیر کے لیے قرآن مجید کی آیت "ولذکر اللہ اکبر" صریح شاہد ہے، جس سیاق میں یہ آیت وارد ہے اس پر غور فرمایا جائے نماز بھی ذکر ہی کی ایک خاص اور زیادہ گہری شکل ہے۔ ۱۲

سامنے تو ہمارا طرزِ عمل یہ ہے، لیکن حضرت جنید بغدادیؒ، سری سقطیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ جیسے ہزاروں بندگانِ خدا کا اجماعی و اتفاقی تجربہ بھی ہمارے لیے موجب اطمینان نہیں۔

۴۔ ایک صاحب نے ذکر میں جہر اور ضرب سے اپنا سخت طبعی انقباض ظاہر کیا ہے اور یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:

"اس میں ریاکاری کا شبہ ہوتا ہے اور آج کل کے اکثر سنجیدہ حضرات اس کو ریاکاری ہی سمجھتے ہیں"۔

جہری اور ضربی ذکر سے طبعی انقباض تو ایک ذوقی اور طبعی چیز ہے، اس لیے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبیعتیں اور اُن کے ذوق بہت مختلف بنائے ہیں، بعض طبیعتیں وہ بھی ہیں، جنہیں جہری اور ضربی ذکر سے ہی انس اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے مشائخ محققین طبیعتوں کے رُخ اور اُن کی مناسبتوں کو دیکھ کر جہری یا سری ذکر، یا دُوسرے اشغال اُن کے لیے تجویز کرتے ہیں، لیکن ذکر بالجہر کے بارے میں ریاکاری کا جو شبہ ظاہر کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک بالکل بے سوچی سمجھی بات ہے۔ اس زمانے میں جبکہ بقول انہی صاحب کے سنجیدہ آدمی ذکر بالجہر کو ریاکاری سمجھتے ہیں۔ اپنا اندازہ یہی ہے کہ کسی کو بالجہر ذکر کرتا دیکھ کر لوگ اس کے معتقد نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے آدمی تو اس کو کم عقل یا مکار اور ریاکار سمجھتے

ہیں۔ پس ایسی حالت میں جہری ذکر میں ریاکاری کا امکان فی زمانہ بہت کم ہے۔ بلکہ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل کے ماحول میں ذکر بالجہر اکثر ریا شکنی کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور دفع خطرات و وساوس میں ذکر بالجہر کی تاثیر اہلِ تجربہ کے نزدیک بالکل مُسلّم ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات بیان اور قابلِ ذکر ہے کہ ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طریقے تصوف کے بعض سلاسل میں معمول ہیں۔ فنِ طب اور علم النفس کی روشنی میں اُن کی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ عاجز تو تصوف کے اکثر اشغال کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ بعض کیفیات اور تاثرات اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے یہ سب ایک طرح کی طبّی اور نفسیاتی تدبیریں ہیں۔

اور اس لیے ان کو اہمیت دینا نہ صرف یہ کہ غیر صحیح ہے بلکہ اصل مقصد کیلئے مضر بھی ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ان چیزوں میں ہر راہرو کا ادراک یکساں ہی ہو، بلکہ بعض اکابر سے سُنا کہ اللہ کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سلوک کی راہ میں اللہ تعالےٰ کی عنایت و توفیق سے بہت تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور سلوک و تصوف کا جو اصل مقصد ہے وہ اُن کو بفضلہ تعالےٰ نصیب ہو جاتا اور آخر تک اُنہیں کسی لطیفہ اور کسی مقام کا بھی ادراک اور احساس نہیں ہوتا۔

اس عاجز کو اس دور کے جن اکابرِ سلوک سے شرفِ نیاز حاصل ہُوا۔ اُن سب کو اس پر متفق پایا کہ خاص کر اس زمانے کے لیے یہی اجمالی سلوک زیادہ مناسب ہے، اور

محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا سلوک بھی اجمالی ہی تھا۔

۵۔ ایک صاحب نے فرمایا :-

"ہم بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ برسوں خانقاہوں میں رہنے اور وہاں ذکر شغل کرنے کے باوجود اُن میں وہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں جن کے لیے تصوف اور خانقاہیت کی ضرورت بتلائی جاتی ہے۔"

بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن انصاف فرمایا جائے یہ حال اب صرف خانقاہوں ہی کا نہیں ہے، بلکہ ہمارے دینی مدرسوں اور دوسرے تمام دینی و اصلاحی سلسلوں کا حال بھی اس وقت یہی ہے کہ سینکڑوں میں دس بیس مشکل سے نکلتے ہیں، تو کیا ان سب کو غلط اور فضول قرار دے کر ایک دم ختم کر دینا صحیح طرزِ عمل ہو سکتا ہے۔ صحیح طریقِ کار ان حالات میں یہ ہے کہ ہر سلسلہ اور ہر ادارہ کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی ہر ممکن کوشش اور تدبیر کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ لیکن نتائج میں کمی اور نقص دیکھ کر اس کو سرے سے ختم کر دینے اور فضول قرار دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ جن ناسازگار حالات میں اور جس انتہائی درجہ کے فاسد اور سخت مادہ پرستانہ ماحول میں ہمارے ان دینی اداروں کو کام کرنا پڑ رہا ہے اُن میں دس پانچ فیصدی کامیابی بھی ہرگز ناکامی نہیں ہے۔

۶۔ ایک صاحب نے فرمایا :-

"صوفیوں کے طرزِ عمل سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ تصوّف دراصل "رہبانیت" اور گوشہ نشینی کا نام ہے اور اسکی تائید کرنا دراصل اسلام میں رہبانیت کو داخل کرنا ہے"۔

میرے نزدیک یہ بھی اُن ہی باتوں میں سے ہے جو اس سلسلہ میں بے سوچے سمجھے کی جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں دراصل خود اُن کے دل میں تصوّف کے ایک غلط معنیٰ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ اپنی اسی غلط فہمی کی بنا پر صوفی صرف اُن ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جو رہبانیت پسند اور گوشہ گیر ہیں اور پھر اپنے اسی تصوّر کی بُنیاد پر وہ یہ کہتے ہیں کہ تصوّف رہبانیت کا نام ہے اور ہر صوفی "راہب" ہی ہوتا ہے۔

اگر یہ حضرات خود اس غلط فہمی میں مُبتلا نہ ہوتے اور تصوّف کے لیے رہبانیت اور گوشہ گیری کو ضروری نہ سمجھتے، تو اس دَور میں بھی ایسے بہت سے بندگانِ خُدا دیکھ سکتے تھے جو بحمد اللہ سچے صوفی بھی ہیں اور مردِ میدان بھی۔ مگر بات وہی ہے کہ جو گوشہ گیر نہ ہو، یہ بے چارے اپنی کم نگاہی سے اُس کو صوفی مان ہی نہیں سکتے۔ اس کا علاج تو خود اپنے علم اور تصوّر کی تصحیح سے ہی ہو سکتا ہے۔

۷۔ مقالہ کے ابتدائی حصّے میں جن بزرگ کی خدمت میں حاضری اور تصوّف کے متعلّق اُن سے اپنی گفتگو کا اس عاجز نے ذکر کیا ہے۔ بعض حضرات کا شدید اصرار ہے کہ ان کا اسمِ گرامی ظاہر کیا جائے، اس لیے عرض کرتا ہوں کہ میرے وہ محسن اور مخدوم

بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہٗ ہیں۔

آخری بات:- آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ناچیز صرف اُس تصوّف کا قائل اور حامی ہے جس کا ذکر اس میں کیا گیا ہے اور یہی اہلِ حق کا تصوّف ہے۔ باقی اس نام سے سینکڑوں خانقاہوں میں شرک و بدعت کا جو کاروبار ہوتا ہے، اللہ نے اپنے جس بندے کو بھی ایمانی بصیرت کا کوئی ذرّہ نصیب فرمایا ہو وہ یقیناً اُس سے بے زار ہو گا۔

⁂

(۴)

تصوّف اور اُس کے اعمال و

اشغال کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب !

از جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، اُن کی حسبِ ذیل دو بڑی قسمیں کی جاسکتی ہیں :-

۱- پہلی قسم ان شکوک و شبہات کی ہے جو رسمی خانقاہوں اور رسمی سجادہ نشینوں کو دیکھ کر یا اُن کے ہفوات سُن کر پیدا ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس شخص کو کتاب و سُنّت کی ادنیٰ واقفیت بھی ہے وہ معمولی غور و فکر کے بعد سمجھ لے گا کہ یہ سب فریب ہے۔ اور حقیقت اس سے بہت دُور ہے۔

۲- دوسری قسم ان شکوک و شبہات کی ہے جو علمی طور پر پیش آتے ہیں، اس قسم کے شبہات زیادہ تر اُن لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کو نہ محققین صوفیہ کی

کتابیں پڑھنے کا موقع ملا ہے اور نہ آپ نے زمانہ کے محققین سے سابقہ پڑا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف فلسفۂ اشراق، جدید افلاطونی الٰہیات اور ہندو جوگ سے ماخوذ ہے حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

فلسفۂ اشراق اور ہندو جوگ میں چند ریاضتوں اور مجاہدوں کے سوا کیا ہے؟ وہ انہیں مجاہدوں اور محنتوں کو مقصود حقیقی جانتے ہیں اور اس کے برعکس ہمارے صوفیہ صافیہ اُن ریاضتوں اور مجاہدوں کو جن کے ساتھ اتباعِ شریعت نہ ہو کوئی وقعت نہیں دیتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ ارشاد فرماتے ہیں :-

"وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلیدِ سُنت سے الگ ہو کر اختیار کئے جائیں، معتبر نہیں ہیں، اس لیے کہ جوگی اور ہندوستان کے براہمہ اور یُونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتی ہیں"

(جلد اوّل مکتوب دو صد و بست و یکم)

مرشد العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی کے ایک کرامت نامہ کے چند الفاظ غور سے سُننے کے قابل ہیں :-

"اور بعض جہلاء جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے، محض اُن کی کم فہمی ہے، طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے، آئینہ زنگ آلودہ ہے تو پیشاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے"

لیکن فرق نجاست اور طہارت کا ہے۔ ولی اللہ کو پہچاننے کے لیے اتباعِ سُنّت کسوٹی ہے، جو متبع سُنّت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے، خرقِ عادات تو دجال سے بھی ہوں گے۔"

(رجوم المذنبین صـ ۱۲۹)

تصوّف کی مشہور و متداول کتابیں سامنے رکھئے:۔ مثلاً کتاب اللمع، تعرف رسالہ قشیریہ، عوارف، فتوح الغیب، احیاء العلوم، مدارج السالکین، ان کتابوں کے صرف ابواب پر نظر ڈال لیجئے۔ اور فیصلہ کیجئے کہ ان کتابوں میں توحید اور اُس کے احوال، اتباعِ سُنّت، عبادات کی خشوع و خضوع کے ساتھ ادائیگی، معاملات کی صفائی اور تصفیہ اخلاق کے سوا کیا ہے؟

بے شُبہ تصوّف کی بعض کتابوں میں کچھ ایسے مضامین بھی آگئے ہیں جن سے بعض طبائع کو وحشت ہوسکتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مضامین تصوّف کے اصول و مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی فہم اُن کو نہیں قبول کرتی ہے تو اُن کو چھوڑ دے، اسی طرح اگر خلافِ شریعت کوئی بات نظر آئے، تو اُن کی وہی حیثیت سمجھئے جو کُتبِ تفسیر میں اسرائیلیات، یا کُتبِ احادیث میں موضوعات کی ہے۔ اب اسرائیلیات یا موضوعات کی وجہ سے کتب تفسیر و احادیث سے تو قطع نظر نہیں کی جاسکتی ہے۔ جس طرح محققین کُتب تفسیر و حدیث میں اغلاط کی تصحیح کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح محققین صُوفیہ بھی اپنے فن میں صحیح کو سقیم سے اور درست کو غلط سے الگ کرتے رہے ہیں،

کوئی وسیع النظر اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مولانا اسمٰعیل شہید کی "صراط مستقیم" ہی کو دیکھئے کہ اُس میں اسی قسم کی بدعات پر متنبہ کرنے کے لیے پورا ایک باب موجود ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات جلد سوم میں شیخ روزبہان بقلی کی کتاب "تبیین غلطات المتصوفہ" کا ذکر موجود ہے جو اسی عنوان پر ہے۔

(مکتوب ہشتاد و نہم)

تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق شکوک و شبہات کے حل کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خود محققین صوفیہ سے تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کی حقیقت اور مقصد کو سُن لیا جائے اور پھر غور کیا جائے کہ شریعت تصوف کے مقصد سے کیا کچھ سوا چاہتی ہے؟ اور کیا تصوف شریعت پر اخلاص کے ساتھ عمل کے سوا اور کوئی چیز ہے؟

تصوف کی مستند اور مشہور کتاب احیاء العلوم کی شرح "اتحاف السادۃ المتقین" میں ہے :-

"بس تصوف کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ریاضتوں :- مجاہدوں سے علم و یقین تک پہنچا جائے"۔ (ص ۳۹)

حضرت مجدد الف ثانی ملا حاجی محمد لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں :-

"شریعت کے تین حصے ہیں :- علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں اجزاء متحقق نہ ہوں، شریعت متحقق نہیں ہوتی ہے۔ جب شریعت متحقق ہو جاتی ہے، حق تعالےٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے جو کہ تمام

دنیاوی اور اخروی سعادتوں سے بالاتر ہے۔ طریقت و حقیقت جس سے کہ صوفیہ ممتاز ہوئے ہیں۔ دونوں (شریعت کے تیسرے حصے (یعنی اخلاص کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں۔ پس ان دونوں (یعنی طریقت و حقیقت) کی تحصیل صرف شریعت کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے۔ احوال و مواجید اور علوم و معارف جو اثناءِ راہ میں حاصل ہوتے ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ ان سب سے گزر کر مقام رضا تک پہنچنا چاہیئے جو کہ سلوک کا آخری مقام ہے۔ اس لیے طریقت و حقیقت کی منزلوں کو طے کرنے کا مقصد تحصیل اخلاص کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اخلاص ہی سے مقام رضا حاصل ہوتا ہے، کوتاہ اندیش احوال و مواجید کو مقصود اور مشاہدات و تجلّیات کو مطلوب جانتے ہیں اور کمالات شریعت سے محروم ہیں۔ بے شبہ مقام اخلاص کا حصول اور مرتبۂ رضا تک وصول ان احوال و مواجید کو طے کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی حیثیت مقصودِ حقیقی کے معاون کی ہے۔ یہ بات اس فقیر پر بہ صدقہ حبیبِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) اس راہ میں دس برس گزارنے کے بعد واضح ہوتی ہے۔

(جلد اول مکتوب سہ و ششم)

مکتوب چہلم میں صراحت سے ارشاد فرماتے ہیں :-

"مخدوما ! منازلِ سلوک طے کرنے اور مقاماتِ جذب قطع کرنے کے بعد یہی معلوم ہوا کہ اس سیر و سلوک کا مقصد

مقامِ اخلاص کی تحصیل ہے۔" (جلد اوّل)

مقصود و وصد و ہفتم (جلد اوّل) میں ارشاد ہے :-

"طریقِ صوفیہ کے سلوک کا مقصد صرف یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ کا یقین بڑھے نیز احکامِ فقہیہ کے اداء میں آسانی ہو۔"

"انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

"اور مقصود صوفیہ کے طریقہ علیہ کا مشاہدہ حق کا حصول ہے۔ "کانک تراہ" اور اس حضور کا نام انہوں نے مشاہدۂ بالقلب رکھا ہے۔" (ص ۳۹)

"القول الجمیل" میں ہے :-

"مشائخ کے تمام طریقوں کا مرجع یہ ہے کہ ایک ہیئت نفسانیہ حاصل ہو جائے، جس کو وہ نسبت کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارتباط و انتساب ہے اور اس کو سکینہ اور نور بھی کہتے ہیں۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

"جب بندہ طاعات، طہارات اور اذکار پر مداومت کرتا ہے تو نفس ناطقہ میں ایک صفت قائم ہو جاتی ہے اور اس توجہ کا ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

(القول الجمیل)

حضرت شاہ مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ "صراطِ مستقیم" میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"جاننا چاہیئے کہ اولیاء اللہ کے ہر طریقہ میں مجاہدات، ریاضات اذکار، اشغال اور مراقبات مقرر ہیں۔ ان امور میں سے ہر ایک طالب کے اندر ایک اثر پیدا کرتا ہے، جس کے سبب سے طالب کو عالمِ قدس سے ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں نسبت کہتے ہیں " (صفہ ۱۶۵)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی جامع کمالات ہستی ابھی قریبی زمانے میں گزری ہے۔ اُن کے ارشاداتِ عالیہ بھی سُن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"پس، ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر و موجود جان کر حیا و شرم کے ساتھ بندہ (کا) مطیع رہنا مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے باقی زوائد "

(مکاتیب رشیدیہ صفہ ۲)

"سُنو کہ سلوک صحابہ و تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور صمت کل الوجوہ محتاج ذاتِ غنی کا اور حضور اس کردگارِ بے نیاز محسن عباد کا ہوتا تھا، بندگی در بندگی، عجز در عجز، توکل در توکل، ہمتِ اطاعت و جان و مال بازی فی رضا المولیٰ اس کا ثمرہ تھا " (صفہ ۲۰)

"اصل الاصول اور اصل مقصود و مامور سلوک صحابہ کرامؓ ہے۔ اس میں بحث بندگی سے اور ایمان بالغیب کے کالمشاہد ہو جانے سے اور تحسینِ اخلاق سے ہے۔" (ص ۳۲)

"مقصد جملہ اشغالات و مطلب و منتہیٰ جملہ مراقبات کا وہ حضورِ قلب بے کیف ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نصیب فرمایا، نسبتِ صحابہ کرامؓ یہی حضور تھا۔" (ص ۹۵)

"برادر! یہ تمام شریعت کا علم اور طریقت کا طریقہ نورِ یقین کی تحصیل کے واسطے ہے اور انجام و منتہیٰ سب کا یہی تو ہے کہ جس کو مسلمان سرسری طور سے علم رکھتے ہیں۔ وہ یقین حق الیقین، مثل مشاہدہ کے ہو جائے، یہ انتہا سب طرق کی ہے۔" (ص ۸۰)

"اور وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو روبرو مالک معبود کے جاننے، اور شرم و حیا طاری ہو جائے، اس کا نام حضور اور یادداشت ہے، اس کو لسانِ شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبتِ معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آتی ہے۔" (ص ۹۵)

سطور بالا میں محققین صوفیہ کے چند اشارات پیش کئے گئے ہیں، ورنہ اس مفہوم کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ چیز تو ظاہر ہو گئی کہ تصوف تحصیلِ اخلاص و یقین کے سوا اور دوسری کوئی چیز نہیں ہے اور اخلاص و یقین کے مطالبہ سے قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیٰ صاحبہا) کے دفاتر بھرے پڑے ہیں۔

☆

اب تصوف کے اعمال و اشغال یعنی اس اخلاص و یقین کی تحصیل کے ذرائع و وسائل کا مسئلہ باقی رہا، تو اس سے متعلق یہ عرض ہے کہ حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیضِ صحبت کی وجہ سے ان وسائل و ذرائع کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی جو بعد کے لوگوں کو پیش آئی۔ وہاں نبوت کا آفتابِ عالم تاب موجود تھا، وہ شمع و فانوس کی فکر میں کیوں پڑتے؟

حضرت مجددؒ نے خوب ارشاد فرمایا:-

"بدن کے قرب کا دلوں کے قرب پر بڑا اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی ولی صحابیؓ کے مرتبے کو نہیں پہنچتا ہے۔"

(مکتوبات جلد اول ص۳۰)

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ "ارشاد الطالبین" میں ارشاد فرماتے ہیں:-

"اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہؓ غیر صحابہ سے افضل ہیں، حالانکہ علم و عمل میں صحابہؓ اور غیر صحابہ مشارکت[1] رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود

---

[1] یعنی جن عقائد و اعمال کے مخاطب و مکلف صحابۂ کرامؓ تھے، انہی کے مخاطب و مکلف ہم بھی ہیں ایسا نہیں ہے کہ ان کے لیے دوسرے اعمال و عقائد تھے اور ہمارے لیے دوسرے، نیز دین کی جن حقیقتوں کا علم ان کو تھا، بعد والوں کو بھی ان کا علم ہوا اور نماز روزہ وغیرہ جو عمل وہ کرتے تھے، بعد والوں نے بھی وہ کئے۔ ۱۲

حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ صحابہؓ نے راہِ خدا تعالےٰ میں جو نصف صاع جَو خرچ فرمایا ہے اگر دُوسرا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو دونوں برابر نہیں۔ یہ فرق ان باطنی کمالات کی بناء پر ہے جو اُن کو حضرت رسول کریمؐ کے فیضِ صُحبت سے حاصل ہُوئے تھے۔"

(ص ۲)

حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے فیضِ صُحبت کے سوا حضراتِ صحابہؓ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور دُوسرے طریقوں سے بھی اس نورِ اخلاص و یقین کو حاصل فرماتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ "القول الجمیل" میں فرماتے ہیں:۔

"میرا گمانِ غالب ہے کہ صحابۂ کرام نسبت کو اور طریقوں سے بھی حاصل فرماتے تھے۔ مثلاً نماز و تسبیحات پر اُن کے شرائط کے ساتھ مواظبت، طہارت اور یادِ موت اور عذاب و ثواب کے خیال پر ملازمت! ان چیزوں سے مادی لذتوں سے بے تعلقی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ حضرات قرآن کی تلاوت اس میں تدبر، وعظ اور زہد ورقاق کی احادیث کے سُننے پر مواظبت فرماتے تھے اور اُس سے اُن کو ایک ملکۂ راسخہ اور ہئیت نفسانیہ حاصل ہوتی تھی۔"

(القول الجمیل)

اس سلسلے میں ایک اہم معاملہ کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے جس پر حضرت مجدد صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ نے متنبہ فرمایا ہے، اس کی تشریح و تفصیل کا موقع نہیں ہے، تاہم ممکن ہے کہ اہلِ ذوق اس سے مطمئن ہوں۔ حضرت مجدد صاحبؒ سے دریافت کیا گیا کہ :-

"فنا فی اللہ اور بقا باللہ اور جذب وسلوک کے تمام مقامات کے طے کرنے کے بعد جو قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرامؓ جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی ایک صحبت کی بناء پر تمام اولیائے اُمّت سے افضل قرار پائے۔ کیا اُن کو محض اسلام قبول کرنے سے یہ سیر وسلوک فیضِ صحبت سے حاصل ہو گیا تھا ؟ اُن حضرات کو علم جذب وسلوک حاصل تھا، یا نہیں ؟ اگر حاصل تھا تو اُس کا کیا نام تھا ؟ اور اگر نہیں حاصل تھا، تو کیا اُس کو بدعتِ حسنہ کہہ سکتے ہیں ؟"

اب مجدد صاحبؒ کا جواب سُنئے :-

"اس اشکال کا حل صحبت سے تعلق رکھتا ہے، وہ بات جو اس مُدت میں کسی نے نہیں کہی۔ ایک مرتبہ لکھنے سے کیسے سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن جب دریافت کیا گیا تو اب جواب سے چارہ نہیں۔ اس لیے مختصر طور سے لکھا جاتا ہے :-

وہ قربِ خداوندی جس کا تعلق فناء و بقاء اور سلوک وجذب سے ہے، قربِ ولایت ہے، اولیائے اُمّت اس سے مشرف ہوئے ہیں،

اور جو قرب کہ صحابۂ کرامؓ کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت میں حاصل ہوا وہ قربِ نبوت ہے، اس قرب میں نہ فنا ہے نہ بقاء نہ جذب ہے نہ سلوک؛ اور یہ قرب قربِ ولایت سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ قربِ حقیقی ہے اور وہ قربِ ظلی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے، مگر ہر شخص کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی ہے، خواص بھی اس موقع پر عوام کے مشابہ ہیں ؎

گر بوعلی نوائے قلندر نواختے !

صوفی بدے ہر آنکہ بہ عالم قلندر است

کمالاتِ قربِ نبوت اگر قربِ ولایت کے راستے سے طے ہوتے ہیں تو فنا و بقاء اور جذب و سلوک سے چارہ نہیں اور اگر اس راستے سے کمالاتِ قربِ نبوت نہ حاصل کیے جائیں، تو فنا و بقا اور جذب و سلوک کی ضرورت نہیں ہے! صحابۂ کرامؓ نے قربِ نبوت کے راستے سے منزل طے کی ہے۔ جذب و سلوک اور فناء و بقاء سے ان کو کام نہ تھا۔"

(مکتوبات جلد اوّل مکتوب سہ صد و سیزدہم)

حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ "صراطِ مستقیم" میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"ایک باریک نکتہ جس سے اہلِ زمانہ ناواقف ہیں حبِ نفسانی اور حبِ عقلی کے درمیان تمیز کرتا ہے، محبتِ نفسانی مبادی سلوک کے

واردات میں سے ہے اور حُبِّ عقلی کمالاتِ[1] انبیاء کرام اور مقاماتِ اولیاء عظام میں سے ہے۔ اکثر عوام صوفیہ نے حُبِّ نفسانی کو حُبِّ عقلی کی جگہ دے رکھی ہے اور اس کو اشاراتِ شرعیہ کا مشارٌ الیہ جانتے ہوئے حضراتِ انبیاء و اولیاء کے سلوک کو اہلِ عشق و مواجید کے احوال سے تطبیق دینا چاہتے ہیں اور لاحاصل تشویشات میں پڑتے ہیں۔" (ص۲)

اصل مقصود یہی سلوک راہِ نبوت ہے، مگر چونکہ سلوک راہِ ولایت سے سلوک راہِ نبوت آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے سلوک راہِ ولایت کو اختیار کیا جاتا ہے۔ حضرت شہیدؒ فرماتے ہیں:۔

"حصول نسبت ولایت سلوک راہِ نبوت کو آسان کر دیتا ہے۔ اور جس کو نسبت ولایت حاصل ہوتی ہے وہ نسبت نبوت کو تھوڑی محنت میں حاصل کر لیتا ہے۔"

("صراطِ مستقیم" ص۸)

اب تصوف کے اُن اعمال و اشغال کا مسئلہ باقی رہا، جن کی ضرورت عہدِ نبوت سے دُوری اور ماحول کی ناسازگاری کے باعث متاخرین کو پیش آئی۔ اس سلسلہ

---

[1] حُبِّ نفسانی کا تعلق سلوک راہ ولایت سے اور حبِّ عقلی کا تعلق سلوک راہِ نبوت سے ہے، جیسا کہ صراطِ مستقیم میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ۱۲

میں اصولی بات یہ ہے کہ ان اعمال واشغال میں ذکر و فکر یہ دو چیزیں بنیادی ہیں اور یہ دونوں چیزیں مامورات شرعیہ میں سے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ ذکر و فکر کے طریقوں، وضعوں اور قیود میں ہے، تو خوب سمجھ لیجئے کہ ذکر و فکر کے یہ قیود، طرق اور اوضاع صرف تدبیر و معالجہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "ایضاح الحق الصریح" میں مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ فرماتے ہیں :۔

"صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا و معالجہ کی سی ہے کہ بہ وقتِ ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو" (ص۸۴)

معالجے کے یہ طریقے حالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ "صراط مستقیم" میں ہے :۔

"ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جُدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر طریق کے محققین تجدید اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں" (ص۲)

اسی لیے محققین نے تصریح فرمادی ہے کہ :۔

"یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی ہے"

(القول الجمیل)

بلکہ اگر ان طرق و اوضاع اور اعمال واشغال کو کوئی مقصود جانتا ہے، تو یہ حضرات اس پر سخت انکار فرماتے ہیں۔ "ایضاح الحق الصریح" میں ارشاد ہے :۔

"وظائف واذکار، ریاضات، خلوت، چلّہ کو مقرر کرنا، ذکر جہری اور ذکر خفی کی وضعوں کو مقرر کرنا، ضرب عدد اور مراقبہ برزخیہ کا مقرر کرنا، اگر طالب ان سب کو اصل کمال شرعی یا مکملات میں سے جانتا ہے تو یہ سب بدعتِ حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف وسائل وذرائع جان کر رواج دیتے ہیں، اُن کے حق میں بدعتِ حکمیہ ہیں، اور اخص الخواص جو ان چیزوں سے بہ وقتِ ضرورت کام لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھڑا دیتے ہیں اُن کے حق میں یہ بدعت نہیں ہے۔" (ص ۳۷)

محققین صوفیہ ان اشغال و اعمال سے کس طرح کام لیتے ہیں اور پھر کس طرح ان سے الگ کر کے اصل مقصود میں لگا دیتے ہیں۔ اس کو جاننے کے لیے صرف مکاتیبِ رشیدیہ میں سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں:۔

"ذکر کے نور کا ملاحظہ جو ابتداء میں تلقین ہوتا ہے، وہ مقصدِ اصلی نہیں بلکہ تمہید ہوتا ہے۔" (ص ۱۵)

"پاس انفاس وغیرہ سب حیلے اس کے ہیں کہ ذکر مخیلہ میں قائم ہو جائے ورنہ اصل مقصود نہیں، جب خیالِ ذکرِ ذات قائم ہو جائے تو زبان اور انفاس کسی کی ضرورت نہیں۔" (ص ۱۶)

"ذکرِ جہری کی اب کچھ حاجت نہیں، ذکر اصل میں تذکرِ قلب ہے سو جب ذکرِ قلبی حاصل ہوا، اب زبان کی کچھ ضرورت نہیں۔" [۱]

(صہ ۱۷)

"سب اذکار و مراقبات تحصیلِ نسبت کے واسطے ہیں، جب نسبتِ یادداشت حاصل ہو چکی اب مراقبات کی درخواست عجیب بات ہے، اب تمہارا سب ذکرِ لسانی، قرآن و صلوٰۃ و ذکرِ مسنون مراقبہ ہے، سب میں یادداشت ہے کہ ثمرۂ مراقبات یہی ہے، اب کسی مراقبہ کی حاجت نہیں، اذکارِ مسنونہ پڑھو، قرآن و نوافل صلواتِ مسنونہ ادا کرو اور بس۔" (صہ ۲۱)

"ضرورتِ تعینِ شغل کی بلندی کے واسطے ہوتی ہے، منتہی اپنے اختیار

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ قلب میں اللہ کے ذکر اور یاد کی کیفیت کو راسخ اور مستقل کرنے کے لیے جو جہری ذکر سالکین کو کرایا جاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ وہ کیفیت پیدا فرمادیں۔ اور رسوخ حاصل ہو جائے تو پھر اس کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ قلب میں اس کیفیت کے پیدا ہو جانے کے بعد ذکر باللسان کیا ہی نہ جائے۔ ذکر جو خود مقصود اور مامور بہ ہے وہ تو تادمِ آخر جاری رہتا ہے۔ حدیثِ نبویؐ میں ہے :- لا یزال لسانک رطباً من ذکر اللہ (مکاتیبِ رشیدیہ کے) اگلے اقتباس سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے۔ ۱۲

میں ہوتا ہے، جس امر سے مطلب برآمد ہو وہی کرے، نہ اُس کو قید ذکرِ زبانی کی ہے، کوئی ذکر ہو، نہ کسی تصورِ خیال کی غرض کام سے ہے۔" (صـ ۲۸)

"والحاصل اگرچہ یہ قوتِ تاثیر اور توجہ وکشف اور تصرف دنیا میں بہت ہے، مگر یہ نورِ یقین مثل کیمیا کے نادرالوجود ہے۔ اگرچہ عالم خالی نہیں، اشغال سب اس کے مقدمات تھے، اب خود مقصود ہو گئے اے کاشکے اس یقین کا شائبہ ہوا بھی اس محروم کو لگ جائے کہ سارا مدار اس پر ہی ہے، اس نسبت کا نام نسبتِ احسان ہے کہ بعثتِ جناب فخرِ رسل (علیہ السلام) کی اس کے ہی واسطے تھی اور صحابہ جملہ اسی نسبت کے حامل تھے۔ علیٰ حسبِ مراتبہم پھر اولیائے اُمت نے دوسرے طریقے سے پیدا کیا کہ ہر ایک نے اشغال اپنے اپنے طریقے کے وضع کئے، سو یہ سب مقدمات اس کے ہیں اور بس! اس کا کوئی طریق معین نہیں، ہر شخص کا طرز جدا گانہ ہے۔" (صـ ۹۱)

تصوف کا مقصد اور اس کے اعمال و اشغال کی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عرض ہے کہ اگر کوئی خوش نصیب ایسا ہے کہ اس کو کسی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر اخلاص و احسان کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے تو وہ بہت ہی مبارک ہے، ورنہ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے خود نفع ہوتا ہے اُسی کو وہ دوسروں کو بتلاتا

ہے۔ اہل اللہ کی بڑی جماعت (جن کے صدق و اخلاص پر سب کو اتفاق ہے) خبر دیتی ہے کہ ذکر و فکر ہی کی راہ سے اُن کو اخلاص و یقین کی دولت حاصل ہوئی ؂

من نہ تنہا دریں میخانہ مستم!
جنیدؒ و شبلیؒ و عطارؒ ہم مست

اس لیے: اگر کسی کو ان کیفیاتِ مطلوبہ کی ضرورت و تلاش ہے، تو وہ اس راہ کو اختیار کرے ؂

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ راہ بحث و نظر کی نہیں، بلکہ جد و جہد اور عمل کی ہے۔ راقم سطور نے کئی برس ہوئے ایک جلیل القدر شیخ وقت (جو بحمد اللہ اب بھی اپنے فیوض و برکات کے ساتھ موجود ہیں) کی خدمت میں عرض کیا کہ :-

"تصوف پر پڑھنے کے لیے کوئی کتاب تجویز فرما دی جائے"

جواب میں ارشاد فرمایا کہ :-

"یہ راہ مطالعہ سے نہیں، بلکہ مجاہدہ سے طے ہوتی ہے"

پھر ارشاد فرمایا کہ :-

"اگر پڑھنا ہی ہے تو شاہ اسمٰعیل شہید صاحبؒ کی "صراطِ مستقیم" پڑھیے۔

بہر حال گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر دل میں جستجو ہے تو کسی صاحبِ کمال کے مشورہ سے کچھ کیجئے۔ ؂

قال را بگذار و مرد حال شو!
پیش مردے کاملے پامال شو!

کسی اور مقصد سے نہیں، تو تجربہ کر کے دیکھئے۔ اگر کسی صاحبِ کمال کی صحبت، یا اُس کے بتلائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے سے حق تعالےٰ کا تعلق بڑھتا ہوا محسوس ہو، ایمان میں تازگی کے آثار پائے جائیں تو فبہا، ورنہ جہاں زندگی میں اچھے اور بُرے بہت تجربے ہوتے ہیں۔ اس کو بھی ایک ناکام تجربہ سمجھ کر چھوڑ دیجئے گا ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی
تا راہ بیں نہ باشی کے راہ بر شوی
در مکتبِ حقائق پیشِ ادیب عشق
ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(۵)

یقین اور اُس کے ثمرات

(از جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی)

تصوف کے بارے میں پیدا ہونے والے بعض شکوک وشبہات سے متعلق جو مضمون مختصر سا گزشتہ صفحات میں ناظرینِ کرام نے ملاحظہ فرمایا، اُس میں ایک جگہ عرض کیا تھا :-

"تصوف کا اصل مقصد مرتبۂ یقین کی تحصیل ہے"

اس یقین کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کو بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی "عوارف" میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"بشری حجابات اُٹھ جانے کے بعد دل میں جو نُورِ حقیقت ظاہر ہوتا ہے، اُس کا نام یقین ہے، جس سے ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے۔ اس سے وہ یقین مراد نہیں ہے جو محض دلائل سے حاصل ہو"

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ "ازالۃ الخفاء" میں فرماتے ہیں :-

"یہاں یقین سے مراد وہ یقینِ خاص ہے جو بطریق موہبت صالحین اُمت کو نصیب ہوتا ہے، اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں یادداشت کہتے ہیں، نہ کہ وہ یقین جو استدلال یا تقلید سے پیدا ہو"

(مقصد دوم صـ ۱۴۲)

یہ یقین عبد اور معبود کے رشتہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اسلامی زندگی کی جان ہے، جس طرح قالب رُوح کے بغیر اور آنکھیں بغیر نور کے بے لطف ہیں، اسی طرح مرتبۂ یقین کے بغیر اعمال بے کیف ہیں۔ صحیح روایت میں ہے کہ :-

"اُمتِ محمدیہ (صلی اللہ علی صاحبہا) کے سوا اور اُمتوں نے گویا فجر سے ظہر تک کام کیا۔ بعضوں نے ظہر سے عصر تک کام کیا اور اُمتِ محمدیہ (صلی اللہ علی صاحبہا) نے عصر سے مغرب تک کام کیا۔ لیکن اجر و ثواب اس اُمت کو اوروں کے مقابلے میں دوگنا دیا جائے گا"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ :-

"یہ فرق قوتِ یقین ہی کی بناء پر ہے"[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ :-

---

[1] کتاب الایمان صـ ۱۰۳ مطبع انصاری دہلی۔

"مجھ کو پوری اُمت کے مقابلے میں وزن کیا گیا تو میرا پلڑا بھاری رہا، پھر اس میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو رکھا گیا تو وہ بھی بھاری رہے، اس کے بعد عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو تولا گیا، تو وہ بھی سب سے وزنی رہے۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ :-

"یہ سب قوتِ ایمانی کا کرشمہ ہے۔"[1]

یہی وہ یقین ہے کہ جس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :-

"جب نور دل میں آتا ہے تو اس میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔"

صحابہؓ نے عرض کیا کہ :-

"یا رسول اللہ! اس کی نشانی کیا ہے؟"

ارشاد ہوا کہ

"آخرت کی رغبت، دُنیا سے نفرت، موت سے پہلے اس کی تیاری۔"[2]

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات، ان کے وعدوں وعیدوں کو کون نہیں جانتا اور مانتا ہے، لیکن ان کا یقین ہم کو کہاں تک حاصل ہے، ہماری عملی زندگیاں

---

[1] کتاب الایمان ص۱۱۱ - ۱۲

[2] مشکوٰۃ کتاب الرقاق - ۱۲

ۓ داس کی شاہد ہیں۔

ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ حق تعالےٰ حاضر و ناظر ہیں، ہمارے ساتھ ہیں رزاق ہیں، سمیع و بصیر ہیں، رؤف و رحیم ہیں۔ شفاء انہی کے ہاتھ میں ہے، موت و حیات اور نفع و ضرر کے وہی مالک ہیں۔ الغرض تمام صفاتِ کمالیہ انہی کے لیے مخصوص ہیں۔ نیز یہ کہ طاعات اُن کی رضا اور معاصی اُن کے غضب کا باعث ہیں۔ لیکن اس جاننے اور ماننے سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اگر ہم کو ان امور کا یقینِ کامل بھی حاصل ہو تو کیا عالم ہو اور ہماری زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب آجائے۔

کیا اپنی حاجات کو حق تعالےٰ کے سوا پھر ہم کسی اور کے سامنے بالاستقلال پیش کر سکتے ہیں؟ کسی معاملے میں ہمارے دلوں میں ان سے شکوہ پیدا ہو سکتا ہے۔ رنج و راحت کے مواقع پر ہم حدود سے بڑھ سکتے ہیں؟ کیا ہم بالقصد ان کی طاعات کو چھوڑ سکتے ہیں اور گناہوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟ ان سے ایک لمحہ بھی غفلت ہو سکتی ہے؟ اور کیا پھر خضوع و خشوع کے بغیر نمازیں ممکن ہیں؟ ان کی معیت کا احساس کیا ہم کو اُنہیں کا نہ بنا دے گا ؎

آمد سحر آں دلبرِ خونیں جگراں

گفتارِ تو بر خاطرِ من بارِ گراں

شرمت بادا کہ من بہ سویت نگراں

باشم تو نہی چشم بہ روئے دگراں

یہ یقین جب دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو احکامِ شرعیہ سے تعلق بڑھتا ہے،

رذائل دب جاتے ہیں اور فضائل کے چشمے اُبل پڑتے ہیں ؎

بلے ہر جا شود مہر آشکارا
سہا را جز نہاں بودن چہ یارا

حضرت خواجہ محمد معصومؒ ملا نعمت اللہ کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ نسبت عارف پر جب غالب ہو جائے گی تو اس کو احکام شرعیہ سے زیادہ ربط ہو گا "

(مکتوبات ۲۲۴)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ "ازالۃ الخفاء" میں تصوف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی تین اصل ہیں :۔

"اصل اوّلؔ :۔ اعمالِ خیر مثلاً نماز، روزہ، ذکر، تلاوت وغیرہ کے ذریعہ سے یقین پیدا کرنا، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب مسلمان بقدر استعداد نیکی کرتے ہیں، مگر ان کو مرتبۂ یقین حاصل نہیں ہوتا ہے۔ استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کے ساتھ تین باتیں اور ملائی جائیں تو یقین پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اعمال میں اخلاص، دوسرے اعمالِ خیر کی زیادتی، تیسرے ان اعمال کی کیفیتِ خاصہ یعنی خشوع وغیرہ۔

اصل دومؔ :۔ یقین سے مقامات پیدا ہوتے ہیں جو شیخ ابوطالب مکی کے حسب تحریر دس ہیں۔ توبہؔ، زہدؔ، صبرؔ، شکرؔ، رجاؔ، خوفؔ، توکلؔ رضاؔ، فقرؔ، محبتؔ۔ جب یقین دل پر قبضہ کرتا ہے تو خوف و رجا سب

خدا سے متعلق ہو جاتا ہے اور اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہوتا ہے۔ یہ نہ جاننا کہ مقامات دس ہی ہیں، بلکہ اس کے سوا بھی ہیں، البتہ بنیادی اور اساسی مقامات یہی ہیں۔

اصل سوم :۔ جب یقین کسی پر طاری ہوتا ہے تو وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے، یقین سے کہتا اور کرتا ہے، مقاماتِ عالیہ اس کے سینے میں پیدا ہوتے ہیں اور دو امور ظاہر ہوتے ہیں، کراماتِ خارقہ اور تربیتِ مریداں "

(مقصد دوم ص۱۴۲ و ص۱۴۳)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ موصوف " حجۃ اللہ البالغہ " میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

" مقامات و احوال کی بنیاد یقین پر ہے، یہ یقین ہی سے توحید اخلاص، توکل، شکر، انس، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محدثیت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں "

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا کہ :۔

" یقین ایمان ہے "

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ :۔

" مجھ کو ایسا یقین نصیب فرما کہ دنیا کی مصیبتیں آسان ہو جائیں "

(مطبوعہ بریلی ص۲۸۱)

مولانا اسمٰعیل صاحب شہید فرماتے ہیں :۔

"جب دل رذائل سے صاف ہو جاتا ہے۔ فضائل مثلاً شجاعت، قناعت، سخاوت، عفت، صبر و شکر، رضا اور توکل خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔" (صراط مستقیم ص ۹۸)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا ارشاد ہے:-

"طالب حق کو چاہیئے کہ اللہ سبحانہ کے ذکر میں ایسا مشغول ہو جائے کہ غیر اللہ اور خود کو مطلق بھول جائے۔ کیونکہ وصول الی اللہ بغیر نفی غیر اللہ کے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ طالب حق جب اس درجہ کو پہنچے گا، زہد، تقویٰ، توکل، عزلت، قناعت، صبر، تسلیم، رضا سب بے قصد حاصل ہو جائیں گے۔"

(ضیاء القلوب ص ۱۳)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:-

"اخلاق ذمیمہ کے دو علاج ہیں، ایک جزئی یعنی خاص وہ یہ کہ ہر خلق کا جُدا جُدا علاج کیا جائے، جیسا احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے اس کو طریق سلوک کہتے ہیں۔ دوسرا کلی یعنی عام، وہ یہ کہ ذکر و شغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے۔ حق سبحانہ کی محبت قلب میں پیدا کی جائے۔ جب اس کا غلبہ ہوگا، اپنی ہستی خودی مضمحل ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاق ذمیمہ جو کہ اس خودی و دعویٰ ہستی سے پیدا ہوتے ہیں زائل ہو جائیں گے۔ اس کو طریق جذب کہتے ہیں۔"

(کلید مثنوی دفتر اول ص ۹)

اسی سلسلے میں پیرِ رومی کے یہ پُر جوش اشعار بھی پڑھ لیے جائیں :-

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد | او از حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما | اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما | اے تو افلاطون و جالینوس ما

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے میں ایک عالمِ ربّانی (اللہ اُن کی برکات سے عرصہ تک استفادہ کا موقع نصیب فرمائے) کے گرامی نامہ کے چند الفاظ بھی نظر سے گزر جائیں ۔ ارشاد فرمایا :-

"ضرورت اس کی بہت زیادہ ہے کہ اذکار میں پُوری جدوجہد کی جائے ، تا آنکہ ذکر طبیعتِ ثانیہ بن کر نسبت مع اللہ پیدا کرتا ہوا احسان جو کہ خلاصہ اور ثمرہ عبادت ہے ، پیدا ہو جائے "

یہ ہے وہ یقین اور اس یقین کے ثمرات جس کی تحصیل کا ذریعہ تصوف ہے ، اب اگر یہ امور کسی درجہ میں مطلوب ہیں تو تصوف بھی اسی درجہ میں مطلوب ہے۔

والعلم عند اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ -

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ سطورِ بالا میں یقین کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس سے کم درجہ کا یقین کوئی وقعت نہیں رکھتا ۔ حاشا و کلا ایسا نہیں ہے ۔ یہاں تو بحث صرف کمال یقین کی تھی ورنہ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کوئی شخص یقین کا کمزور درجہ بھی اگر رکھتا ہے تو انشاء اللہ آخرت میں وہ بیکار نہ ہوگا ۔ گو اہل ایمان کی

مان نہی ہونا چاہیئے کہ وہ ایمان و اسلام کے اعلٰی درجہ پر فائز ہوں۔

حضرت شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ :-

"جو شخص ان احوال و مقامات سے متصف ہو، اُس کو چاہیئے کہ ان لوگوں کی تعظیم میں کوتاہی نہ کرے جو ان امور سے بے خبر ہیں، اس لیے کہ ہر مُسلمان حق تعالےٰ کا نام لیتا ہے۔ پس اوّل تو مسلمان کی تعظیم اس نامِ پاک کی عظمت کی وجہ سے ہونا چاہیئے۔ دُوسرے یہ کہ آدمی خود اپنے آغاز و انجام کو دیکھے۔ تیسرے حق تعالےٰ کے لیے دشوار نہیں کہ کسی کو ایک لمحہ میں قطب الاقطاب بنا دیں"

(صراط مستقیم ص۱۱۶)

شاہ صاحب ہی کا ارشاد ہے کہ :-

"اصلاحِ اعمال و عادات اور فضائلِ اخلاق کا جو ذکر ہُوا تو رضائے حق کے لیے اور بارگاہِ خداوندی میں مقبولیت، عزّت اور اعتبار کے لیے ہے، ورنہ مدارِ نجات تو صرف اُسی کلمہ پہ ہے جو صدق دل سے ادا ہو"

(صراط مستقیم)

(۶)

تصوّف اور شیخین[1]

(از مولانا محمد ادریس صاحب ندوی نگرامی)

تصوف سے انکار اور اس کی تنقید کے سلسلے میں بعض حلقوں کی طرف سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن القیمؒ کا نام بھی کثرت سے لیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ مولانا محمد ادریس صاحب کا یہ مختصر مقالہ اس سلسلے میں اہلِ انصاف کے لیے تشفی بخش ہو گا۔" (نعمانی غفر لہ)

حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کا نام لے کر اگر آج ہندوستان میں تصوف صحیح کی مخالفت کی جائے تو اہلِ علم مخالف کے مبلغ علم کے متعلق اچھی رائے نہ قائم کر سکیں گے۔

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ و حافظ ابن قیمؒ۔ ۱۲

اسی طرح اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دے کر حقیقی تصوف پر ناروا تنقید کی جائے تو جن لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کی کتابوں کو پڑھا ہے اور جن کو ان بزرگوں (خصوصاً حافظ ابن قیمؒ) کے تصوف و احسان میں مرتبہ کا کسی قدر کتابی علم ہے، وہ ان ناقدین کے متعلق زیادہ بہتر خیال ظاہر نہ کرسکیں گے۔

ہم امکان کی حد تک حسنِ ظن سے کام لینا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان ناقدین نے شیخین کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرمایا ہے۔ ورنہ شیخین کا نام لیکر وہ تصوف کی اس بیباکی کے ساتھ مخالفت نہ کرتے۔[۱]

---

[۱] یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، ایک مرتبہ راقم سطور نے اپنے استاد علامہ سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیم کے یہاں چونکہ تفلسف نہیں ہے اس لیے اُن کی کتابوں میں بے حد جی لگتا ہے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ابھی آپ نے ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کو نہیں پڑھا ہے جو فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں، اسوقت تک عاجز نے شیخین کے فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث کو نہیں پڑھا تھا، پھر جب سید صاحب کی راہنمائی میں شرح عقیدہ اصفہانیہ کا مطالعہ کیا تو سید صاحب نے فرمایا:- جب علم کلام کی سیر کا جی چاہے تو ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑ کر سیر کر لیا کیجئے گا "بہت پُرامن راستہ ہے"۔

اسی طرح یہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ لوگوں نے ابھی ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کو بہت کم پڑھا ہے، جو تصوف کے مباحث میں عالمانہ کلام کرتے ہیں، ورنہ تصوف کے متعلق نقطۂ نظر دوسرا ہوتا - ۱۲

بے شبہ شیخین کی کتابوں میں تصوف کے بعض مسائل پر سخت تنقید ملتی ہے، اسی طرح متصوفین پر وہ سخت دارو گیر بھی کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تنقید کن صوفیہ پر اور کس تصوف پر ہے؟ کیا اُس تصوف پر جو کتاب وسنت کا اصل مقصد ہے؟ جس کا منتہیٰ رضائے حق ہے؟ جس میں قدم قدم پر کتاب وسُنت کے اتباع کی تاکید ہے؟ جس کی تعلیم حسن بصریؒ، ابراہیم بن ادہمؒ، فضیل بن عیاضؒ، معروف کرخیؒ، بشر حافیؒ، شقیق بلخیؒ، جنیدؒ، سہل تستریؒ، ابوطالب مکیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے دی ہے؟ یہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:-

"یہ اسلام کے مشائخ ہیں، ائمہ ہدایت ہیں، خدا نے اُن کے حق میں اُمت کے اندر "لسان صدق" رکھ دیا ہے"

(جلاء العینین ص ۵۹)

انہوں ابراہیمؒ بن ادہم، فضیلؒ بن عیاض، معروفؒ کرخی، ابوسلیمانؒ دارانی، احمدؒ بن الحواری، اور سریؒ سقطی کے متعلق ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:-

"واکابر شیوخ الصالحین[1] "

ایک موقع پر فضیلؒ بن عیاض، ابراہیمؒ بن ادہم، ابوسلیمانؒ دارانی، معروفؒ کرخی جنیدؒ بن محمد، سہلؒ بن عبداللہ تستری اور انہی کے مثل لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"یہ کتاب وسُنت کے مشائخ ہیں"

---

[1] فی السماع والرقص - ۱۲

02470

پھر کہتے ہیں :-

"رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین[1] "

تصوف اور اتباعِ سُنّت :-

حقیقی تصوف کی مخالفت تو در کنار، حافظ ابنِ قیمؒ تو دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ :-

"طریق کتاب و سنت میں مقید ہے[2] "

شیوخ عارفین کا اجماع نقل فرماتے ہیں کہ :-

"تصوف کتاب و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے "

اور بطور سند کے حسب ذیل بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے ہیں :-

سید الطائفہ جنیدؒ، ابو حفصؒ، ابو سلیمانؒ دارانی، سہلؒ بن عبداللہؒ، سریؒ، ابو یزیدؒ، احمدؒ بن ابی الحواری، ابو عثمانؒ نیشاپوری، ابو الحسنؒ نوری، محمدؒ بن الفضل، عمروؒ بن عثمان مکی، ابو سعیدؒ خراز، ابن عطاؒ، ابو حمزہؒ بغدادی (ان کو امام احمد بن حنبل صوفی کہہ کر پکارا کرتے تھے) ابو اسحٰقؒ رقی، ابو یعقوبؒ نہر جوری، ابو القاسم نصرؒ آبادی، ابو بکر طمستانیؒ، ابو عمروؒ بن نجید۔

حافظ صاحب موصوف فرماتے ہیں :-

---

[1] الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان صفحہ ۔ ۱۲

[2] مدارج السالکین جلد ۳ صفحہ ۵۵ ۔

"اس راستہ سے جو صوفیہ الگ ہیں، وہ طریق کے رہزن اور ابلیس کے کارندے ہیں[1]"

ایک جگہ تصوف کے متعلق بحث فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ :-

"تصوف سُنّت ہی پر عمل کا نام ہے"

اس موقع پر جمہور یں اھل الاستقامۃ ائمۃ الطریق اور علمائے طائفہ کے اقوال سے استشہاد کرتے ہیں۔

سریؒ، سید الطائفہ جنیدؒ، ابراہیمؒ بن محمد نصر آبادی، اسمٰعیلؒ بن نجید، احمدؒ بن ابی الحواری، شبلیؒ، ابو یزیدؒ بسطامی، سہلؒ بن عبد اللہ[2]۔

"اغاثۃ اللهفان" میں فرماتے ہیں :-

"اہل استقامۃ صحیح راستہ پر ہیں اور کتاب و سُنّت کے بغیر وہ خواطر و ہوا جس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں" (ص ۲۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ :-

"کتاب و سُنّت کا ہر معاملہ میں لحاظ، اولیاء اللہ کے نزدیک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بہ کثرت اس کی ہدایات موجود ہیں"[3]

---

[1] مدارج السالکین ج ۲ ص ۲۳۰

[2] ایضاً ج ۲ ص ۲۴

[3] الفرقان ص ۳۱ ۔

فنِ تصوّف کی اہمیّت :-

شیخ الاسلام ہروی صفا کی بحث میں لکھتے ہیں کہ :-

" اس کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ اس علم کا ہے جو سلوک طریق کے لیے انسان کو سنوارتا ہے "

حافظ ابن قیمؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ :-

" جس علم صافی کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ وہی علم ہے جس کی قوم (یعنی صوفیہ اصحاب طریقت) نے وصیت کی ہے اور اس کی مفارقت سے ڈرایا ہے اور جس نے اس علم کو چھوڑا، اس کو بالکلیہ اہلِ طریق میں سے نکال دیا ہے اور یہی وہ علم ہے جس کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم لے کر تشریف لائے تھے "

حضرت جنیدؒ ہمیشہ فرماتے تھے :-

" ہمارا یہ علم کتاب وسُنت میں مقید ہے، پس جو کتاب وسُنت سے الگ ہو، اُس کی پیروی نہ کی جائے۔ یہی وہ علم صافی ہے جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہے، یہ اس علم والے کو طریق عبودیت پر چلنے کے لیے سنوار دیتا ہے " [1]

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :-

---

[1] مدارج السالکین جلد ۲ ص ۹ ۔

"تصوف سلوکِ حقیقی کا ایک گوشہ ہے اور اس کا کام نفس کی تہذیب اور اس کا تزکیہ ہے، تاکہ اس کو رفیقِ اعلیٰ کی صحبت کی سیر کے لیے تیار کر دے"[1]

حضرت جنیدؒ کے قول اذا اراد اللّٰہ بالمرید خیرًا وقعہ علی الفقراء منعہ صحبۃ القراء کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"قاری سے مراد ان لوگوں کے نزدیک وہ شخص ہے کہ جس کا رجحان عبادات کے ظاہر کی طرف ہو اور اہلِ تصوف، اربابِ قلوب اور اہلِ معارف کے پاس جو ارواح معارف حقائق ایمان، رُوحِ محبت اور اعمالِ قلوب ہیں ان کو اس کی خبر نہیں ہے۔ پس جنیدؒ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی پر خدا کا فضل ہوتا ہے اس کو صوفیہ کے پاس جانے کی توفیق ملتی ہے جو اس کے اخلاق کی تہذیب کرتے ہیں۔ ذمائم اخلاق کا ازالہ کرتے ہیں، منازلِ طریق کی خبر دیتے ہیں اور قراء صرف ظاہری عبادات پر لگاتے ہیں اور اعمال کی چاشنی نہیں سکھاتے ہیں"

حافظ ابن قیمؒ اس سلسلہ میں اپنا مشورہ دیتے ہیں کہ :-

"ہوشمند کا کام یہ ہے کہ ہر جگہ سے وہ اپنا حصہ لے اور ہر جماعت سے بہتر معاملہ کرے، یہ طریقہ صادقین کا ہے"[2]

---

[1] مدارج السالکین جلد ۲ ص۱۱ [2] ایضاً ص۲۰ [3] ترجمہ :- اللہ تعالیٰ جب مرید کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو فقراء کی صحبت میں ڈال دیتا ہے اور قراء کی صحبت سے رد کر دیتا ہے

حقیقی تصوف اور صحیح صوفیہ کے متعلق شیخین کی تصریحات بالا کے بعد کیسے کہا جا سکتا۔ کہ یہ حضرات تصوف کے مخالف تھے۔

اصل یہ ہے کہ ناقدین کو غلط فہمی ہے، ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی تنقید تصوف اور اہل حق صوفیہ پر نہیں ہے، بلکہ ان کو فلسفیانہ تصوف سے اختلاف ہے۔ فلسفیانہ تصوف کسے کہتے ہیں؟ اس کو حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کی زبان سے سنیئے :-

"فلسفیانہ تصوف سے مقصود الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات (؟) اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے ان کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے، اس فلسفیانہ تصوف کا ماخذ یونان کا اشراقی اور اسکندریہ کا افلاطونی اسکول ہونا بعض قدیم مسلمان حکماء کے نزدیک بھی مسلم تھا"

مشہور حکیم ابوریحان البیرونی کہتا ہے کہ :-

"سوف یونانی میں حکمت کو کہتے ہیں اور اسی سے فلیسوف کو یونانی میں "پیلاسوپا" کہتے ہیں، یعنی حکمت کا عاشق، چونکہ اسلام میں بعض لوگ ان کے قریب گئے، اس لیے وہ بھی اسی نام (صوفیہ) سے پکارے گئے"

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "فی السماع والرقص" میں لکھتے ہیں :-

"اور ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا کیا، جس کو اس نے پہلے کے

یونانی فلاسفہ اور (مسلمانوں میں سے) بدعتی متکلمین جہمیہ وغیرہ کے خیالات سے ملا کر بنایا تھا اور بہت سی علمی اور عملی باتوں میں وہ اسماعیلی ملحدوں کے راستے پر چلا اور کچھ باتیں اس میں صوفیہ کی ملا دیں جو حقیقت میں اس کے ہم خیال اور اسماعیلی قرامطہ باطنیہ کے خیالات سے ماخوذ تھیں، کیونکہ ابن سینا کے اہل خاندان مصر کے حاکم بامر اللہ (فاطمی اسماعیلی) کے پیروؤں میں سے تھے۔ یہ لوگ اسی زمانہ میں تھے اور ان کا مذہب رسائل اخوان الصفا والوں کا مذہب تھا۔"

حاجی خلیفہ چلپی "کشف الظنون" میں تصوف کے ضمن میں لکھتا ہے کہ :-

"اور جاننا چاہیئے کہ حکمائے الٰہیات میں سے اشراقی مشرب اور اصطلاح میں صوفیوں کے مانند ہیں۔ خصوصاً اُن میں سے پچھلے (اشراقی) لیکن فرق صرف ان مسائل میں ہے جن میں اشراقیہ کا مذہب اسلام کے مخالف ہے اور یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ اصطلاح (تصوف) انہی کی اصطلاح (سوفت) سے ماخوذ ہو جیسا کہ اس شخص سے چھپا نہیں ہے، جس نے اشراقی فلسفہ کی کتابیں دیکھی ہیں۔"

ان حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فلسفیانہ تصوف، فلسفۂ اشراق، جدید افلاطونی الٰہیات اور اخوان الصفاء کی تاویلات ایک ہی سرچشمہ کی دھاریں ہیں۔[1]

---

[1] ...م خاص (مختصراً)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کو اسی فلسفیانہ تصوف سے اختلاف تھا اور اسی تصوف سے پیدا شدہ مسائل پر وہ کڑی تنقید کرتے تھے۔ خود ابن تیمیہ کہتے ہیں :۔

"ان لوگوں نے تصوف میں گفتگو کی، لیکن مسلمانوں کے طریق پر نہیں، بلکہ فلاسفہ کے طریق پر"۔ [1]

رسالہ "علم الظاہر والباطن" میں باطنیہ اور قرامطہ کی تلبیسات کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"اور اسی قسم کی بہت سی باتیں متکلمین صوفیہ کے کلام میں راہ پا گئیں"۔ [2]

حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ تعالےٰ علیہ زنادقہ صوفیہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"طریق کے راہزن زنادقہ صوفیہ اور ملاحدہ وہ ہیں جو پیغمبر کی پیروی کو طریق میں ضروری نہیں جانتے ہیں"۔ [3]

شیخین بلکہ تمام علماءِ حق کی مخالفت اسی طبقۂ صوفیہ سے ہے، ورنہ جہاں تک صحیح تصوف اور اہلِ حق صوفیہ کا معاملہ ہے، شیخین ان کا اعتراف اور پورا احترام کرتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ :۔

---

[1] جلاء العینین ص۴۳ ۔ [2] مجموعۂ رسائل منیریہ (اول)

[3] مدارج السالکین ۔

"صوفیہ میں بعض متکلمین کے طریق پر ہیں اور بعض اہلِ فلسفہ کے طریق پر اور ایک جماعت وہ ہے جو اہلِ حق کے مسلک پر اور سنت پر ہے۔ جیسے فضیل اور تمام وہ لوگ جن کا امام قشیریؒ نے رسالہ میں ذکر کیا ہے[1]"

رسالہ قشیریہ بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے، اس میں تراسی[83] اکابر صوفیہ کا ذکر ہے، ابن تیمیہؒ ان کو مسلک اہل السنۃ پر مانتے ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں کہ محققین صوفیہ آج بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

ابن تیمیہؒ اپنے رسالہ "فی السماع والرقص" میں صالح متصوفین کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

"یہ لوگ محققین صوفیہ اور اُن کے ائمہ کے برعکس ہیں"

معلوم ہوا کہ ابن تیمیہؒ کو محققین صوفیہ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے مدارج السالکین میں صوفیہ کی عبادات [illegible] احوال [illegible] اعتقادات بیان کی ہیں اور ان کی مدح فرمائی ہے[2]

ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ :-

"حضراتِ صحابۂ کرام اور اُمت کے دوسرے کاملین علم اور حال دونوں کے جامع تھے، جب اہلِ علم اور اہلِ حال میں تفریق

---

[1] جلاء العینین ص۳۵ -

[2] مدارج السالکین (جلد ۲، ص۸۱ -

ہو گئی، اسی وقت سے نقص اور خلل پیدا ہو گیا "۔[1]

ابو العباس بن العریف نے اپنی کتاب "محاسن المجالس" میں محبت اور شوق پر گفتگو کی ہے۔ حافظ ابن قیمؒ اس پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ہم ان کے کلام کو ذکر کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں اللہ تعالےٰ نے جو مضامین منکشف فرمائے ہیں، اُن کو بھی نفع کی اُمید پر لکھتے ہیں، اللہ تعالےٰ اپنے بندے پر احسان فرمائے اور اُس کو علم سے حال کی طرف اور وصف سے اتصاف کی طرف لے جائے۔ (یعنی اُس کے علم کو اُن کا حال بنا دے) اور ان اوصاف کا متصف بنا دے "۔[2]

باب الذوق میں فرماتے ہیں کہ :-

"جن لوگوں نے ایمان کا دعوےٰ کیا، لیکن وہ صاحبانِ ذوق نہ تھے، حق تعالےٰ نے اُن سے فرمایا کہ اپنے کو مومن نہ کہو، مسلم کہو

قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم

پس یہ لوگ مسلمان ہیں، مومن نہیں، اس لیے کہ ایمان اُن کے دل کے اندر رچا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صاحبِ ذوق نہ ہونے

---

[1] مدارج السالکین، جلد ۳، صـ ۸۴ ۔

[2] طریق الھجرتین ، صـ ۳۸۰ ۔

کی وجہ سے یہ لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، یا اُن کے اعمال کے اجر میں کمی ہوگی (البتہ صاحبِ ذوق کا معاملہ ہی دُوسرا ہے) ذوق ایک باطنی امر ہے اور عمل اس کا نشان ہے۔ پس اعمال علوم وعقائد کے ثمرات ہیں اور یقین سے جہاد اور احسان کے مقامات پیدا ہوتے ہیں"۔ [1]

ذرا غور کیجئے کہ یہ جلیل القدر شیخ اذواق صحیحہ اور احوالِ صالحہ (جو کہ ثمراتِ مجاہدات میں سے ہیں) کا کیسا مدّاح ہے؟

"مدارج السالکین" میں امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ:-

"میں نے صُوفیہ کی صحبت اختیار کی اور ان کی دو باتوں سے بڑا نفع اُٹھایا، ایک یہ کہ وقت ایک تلوار ہے۔ اگر تم اس کو نہ کاٹو گے تو وہ تم کو کاٹ دے گا اور دوسری بات یہ کہ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کروگے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کر دے گا"۔

حافظ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں کہ:-

"یہ کتنے قیمتی فقرے ہیں اور اپنے قائل کے علوِ ہمت پر دلالت کرتے ہیں اور امام شافعیؒ کی یہ منقبت اس طبقہ (صوفیہ) کی جلالتِ شان کے لیے کافی ہے"۔ [2]

---

[1] مدارج السالکین ج ۳ ص ۵۸ [2] ایضاً ص ۸۰ -

شیخین کو صوفیہ کے جس مسئلہ سے زیادہ تر اختلاف تھا وہ وحدت الوجود کا مسئلہ[1] تھا۔ جس وحدت الوجود سے ان کو اختلاف تھا اس کی حقیقت بھی انھی کی زبان سے سُن لیجیے:۔

"اس وحدت الوجود کی غایت یہ ہے کہ اس کے ماننے والے عبد اور معبود خالق اور مخلوق آمر اور مامور طاعت اور معصیت میں فرق نہیں کرتے۔[2] ملاحدہ اہل وحدت الوجود کے نزدیک غیر حق، عین حق میں گُم ہو جاتا ہے، بلکہ غیر حق کا وجود نفس حق کا وجود ہوتا ہے، حس دونوں وجودوں میں فرق کرتا ہے۔ لیکن جب حس غائب ہوتا ہے تو کُھل جاتا ہے کہ غیر حق کا وجود عین حق ہے[3]۔"

اس وحدت الوجود کے متعلق خود محققین صُوفیہ کا مسلک کیا ہے؟ ذرا اس کو بھی گوش ہوش سے سُنئے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشاد ہے:۔

"عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہو گئے، یہ تو صریح کُفر ہے[4]۔"

اب اس مسئلہ کی اصل حقیقت بھی مولاناؒ سے سمجھ لیجئے:۔

"گو ممکنات موجود ہیں، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ان کو وجود دیا ہے۔ موجود کیوں نہ ہوتے، مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص وضعیف وحقیر ہے، اس لیے وجود ممکن کو وجود حق کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے، جب یہ کالعدم ہُوا تو وجود معتدبہ

---

[1] القول الجلی بحاشیہ جلاء العینین ص۲۴ [2] طریق الہجرتین ص۲۲۳۔
[3] مدارج السالکین ج۳ ص۸ [4] تعلیم الدین ج۱ ص۹۵

ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدت الوجود کے، کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے ایک ہونا وجود کا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دو، اگر ہے سہی، مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں، مگر اس کو اتفاقاً وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توحید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں فنا کہلاتا ہے، یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدۃ الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے ایک ہونا شہود کا، کہ واقع میں تو ہستی متعدد ہیں، مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں۔ پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے۔ کما قال مرشدی مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے اس لیے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا[1]"

مسئلہ کی اس تفصیل کو ذہن میں رکھئے اور اب دیکھئے کہ شیخین کے ارشادات اس سلسلہ میں کیا ہیں؟ حافظ ابن قیمؒ کی ایک تقریر کا مفہوم حسب ذیل ہے:۔

"جس طرح انوارِ مخلوقہ نورِ حق کے سامنے اور علم خلق علمِ حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے، اسی طرح

---

[1] کلید مثنوی شرح شعر ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ
زندہ معشوق است و عاشق مُردۂ

زمان، دہر اور وقت دوامِ الٰہی کے سامنے مضمحل ہے۔ جب سالک پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے، قوتِ تمیز کمزور ہوتی ہے اور حال غالب ہوتا ہے تو اہلِ استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ ماثمّ الوجود الا اللہ۔ ماثمّ موجود الحقیقۃ الا اللہ ھنالک یفنی من لم یکن ویبقی من لم یزل بے شبہ وجودِ حق اور جب اس کا دوام ماسویٰ پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور یہیں سے وحدۃ الوجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہو گئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے۔ اور اس قسم کے مشتبہ کلمات کو (جو اہلِ استقامت کی زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سنگِ بنیاد قرار دے دیا۔"[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فناء کی تین قسمیں کرتے ہیں:۔ پہلی فناء انبیاء اور کاملینِ اولیاء کا حصہ ہے۔ دوسری قسم قاصدینِ اولیاء و صالحین کو نصیب ہوتی ہے، اس دوسری قسم کی ضمن میں شیخ فرماتے ہیں:۔

"دوسری قسم ماسواء کے شہود سے فناء ہے اور یہ اکثر سالکین کو پیش آتی ہے۔ خدا کی محبت، عبادت اور یاد کی طرف انجذاب سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ محبوب و مطلوب کا استغراق غیر کا شعور نہیں باقی رہنے

---

[1] مدارج السالکین ج ۳ ص ۸۶۔ اس بحث کو طریق الہجرتین ص ۳۳۲۔ نیز مدارج السالکین جلد اوّل ص ۸۳ میں ملاحظہ کیا جائے۔ ۱۲

دیتا ہے۔ پس موجود کا وجود، مشہود کا شہود اور مذکور کا ذکر اس سے
غائب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مخلوق (اس کی نگاہ میں) فنا ہو جاتی ہے
اور صرف خدا باقی رہ جاتا ہے (چونکہ پہلی قسم کی فنا سے اس فنا کا
درجہ کم ہے، اس لیے) انبیاء اور اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ
حضرت عمرؓ اور سابقین اوّل کو یہ فنا پیش نہیں آئی۔ ان امور کی
ابتداء تابعین کے عہد سے ہوئی ہے اور شیوخ صوفیہ سے مثلاً
ابو یزیدؒ، ابوالحسن نوریؒ، ابوبکر شبلیؒ وغیرہ کو یہ حالات پیش آئے
اور ان کے سوا ابو سلیمان درانیؒ، معروف کرخیؒ، فضیل بن عیاضؒ، بلکہ
جنیدؒ کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی۔" [1]

غور کیجئے کہ محققین صوفیہ کے وحدت الوجود یا وحدت الشہود میں اور شیخین کی
بیان کردہ اس فناء میں کیا فرق ہے؟

کوئی شبہ نہیں کہ فنا کے اس مرتبہ کو شیخین وہ اہمیت نہیں دیتے ہیں جو فناء کی
پہلی قسم کو اُن کے نزدیک حاصل ہے، مگر اس مرتبہ کو نہ صرف یہ کہ وہ گمراہی نہیں قرار
دیتے ہیں بلکہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرات تابعین کے وقت سے یہ کیفیات پیدا ہونا
شروع ہو گئی تھیں۔ حافظ ابن قیمؒ کی وسعتِ خیال کا تو یہ عالم ہے کہ اگر سالک غلبۂ
حال میں "سبحانی" یا "ما فی الجبۃ الا اللہ" کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی
کے لائق جانتے ہیں۔ [2]

---

[1] العبودیۃ ص ۹۸۔

[2] مدارج السالکین ج ۱ ص ۹۰ و طریق الہجرتین ۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کا حوالہ دلیر تصوف صحیح کی مخالفت کرنا ہرگز قرینِ انصاف نہیں ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابوں[1] کو

---

[1] فنِ تصوف پر حافظ ابن قیمؒ کی سب سے مفصل کتاب "مدارج السالکین" ہے جو تین جلدوں میں علامہ رشید رضا مصری مرحوم کے اہتمام میں چھپی ہے، اُسکے ٹائیٹل پیج پر درج ہے :۔

"یہ وہ کتاب ہے جس میں تصوف اور معارفِ الٰہیہ کے حقائق کتاب و سُنّت اور سلف صالحین کیمطابق بیان کئے گئے ہیں۔ مصر کے ایک مشہور عالم شیخ حامد فقی (جو شیخین کے خاص محبین میں سے ہیں اور ان کے علوم کی نشر و اشاعت کا بہت شوق رکھتے ہیں) کو بڑا غم ہے کہ حافظ ابن قیمؒ نے اس کتاب میں شیوخ صوفیہ سے بکثرت نقل کیوں کیا ہے اور ان کے کلام کو اسلامی کیسے قرار دے دیا ہے ؟ (حاشیہ العبودیۃ ص۲۹)۔

شیخ حامد کو یہی شکایت ابن تیمیہؒ سے بھی ہے کہ انھوں نے مشائخ صوفیہ کی تعریف کیوں کی ہے ؟ (حواشی العبودیۃ) اللہ اکبر! یہ الناس اعداء لما جھلوا کی کیسی دردناک صورت حال ہے۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی ہر رائے بہتر اور قابلِ ترجیح، لیکن جب وہ کوئی ایسی چیز بیان کریں جس کو اپنا نفس نہ قبول کرے تو وہ کسی دلیل کے بغیر رد کردی جائے ؟

علامہ رشید رضا مصری نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے۔ انھوں نے بھی تصوف کے متعلق عام خیال بہتر نہیں ظاہر کیا ہے مگر مجبوراً یہ اقرار کرتے ہیں کہ بے شبہ صوفیہ حقائق ہیں جن کے سامنے فقہاء و متکلمین کی گردنیں جھک گئی ہیں اور یہ درحقیقت علماء حکماء ہیں۔ اسی دیباچہ میں کہتے ہیں کہ صالح صوفیہ نے اسرار شریعۃ کے بیان اور تربیتِ اخلاق کے ذریعہ سے اسلام کی خدمت کی ہے "

پڑھا جائے، دیکھا جائے کہ یہ مسائل تصوف پر کیسی عالمانہ بحث فرماتے ہیں، مشائخ کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ صحیح وسقیم میں امتیاز کرتے ہیں۔ راجح و مرجوح میں فرق فرماتے ہیں۔ صوفیہ کے درمیان مختلف فیہ مباحث میں محاکمہ کرتے ہیں۔ اگر یہ اس راہِ حق کے رہرو اور بحرِ معرفت کے شناور نہ ہوتے تو اس فن میں یہ مرتبہ پانا ممکن نہ تھا۔ اقوال کے سوا خود اُن کے احوال کو ملاحظہ کیجئے۔ ذکرِ الٰہی کی کثرت، عبادات میں خشوع وخضوع اور تبتل الی اللہ کا کیا عالم تھا؟ اگر طولِ مبحث کا خوف نہ ہوتا تو میں اُن احوال کو نقل کرتا جو حافظ ابن قیمؒ نے "مدارج السالکین" میں ابوابِ تصوف کے ماتحت حافظ ابنِ تیمیہؒ کے متعلق نقل فرمائے ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ مُلّا علی قاریؒ نے صراحتہً فرمایا ہے کہ :-

"جو شخص منازل السائرین کی شرح (مدارج السالکین) کو دیکھے گا اُس پر واضح ہو جائیگا کہ یہ دونوں حضرات (ابن تیمیہؒ وابن قیمؒ) نہ صرف یہ کہ اہل سنت والجماعت میں سے ہیں، بلکہ اس اُمت کے اولیاء میں سے ہیں۔"[1]

حافظ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں :-

"ابن قیمؒ کو تصوف میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور ان کو اذواق ومواجید صحیحہ کا بڑا حصہ ملا تھا، جس پر اُن کی کتابیں شاہد ہیں"۔[2]

ان حقائق کے انکشاف کے بعد ہمارے ناقدین اور معترضین شیخین کی کتابوں کو پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ ان بزرگوں کو کس تصوف سے اختلاف تھا؟

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۲۷۴۔

[2] جلاء العینین ص ۲۰۔

اگر فلسفیانہ تصوف کے سوا صحیح تصوف میں بھی کسی موقع پر انہوں نے اختلاف رائے ظاہر کیا ہے تو اس پر غور کیجئے کہ یہ اختلاف تصوف کے اصول و مقاصد سے ہے یا فروع میں۔ آپ یقین کریں کہ ان دونوں بزرگوں کو تصوف کے اصول اور مقصد سے مخالف کہیں نہ پائیں گے باقی فروع میں اختلاف کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ نیز یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ باایں ہمہ جلالت قدر و رفعت شان بہرحال غیر معصوم انسان تھے، جسطرح دوسروں کی رائے غلط ہوسکتی ہے اسی طرح وہ بھی غلطی کرسکتے ہیں اور ان کا اختلاف مسئلہ کے سقم کی نشانی نہیں ہے۔ اور اگر ان کا اختلاف صحیح بھی ہے تو کسی مسئلہ میں اختلاف کے یہ کب معنی ہیں کہ پورے فن کے مخالف تھے۔ بہتر ہو کہ ہمارے ناقدین خود حافظ ابن قیمؒ کی رائے کو قبول کرلیں جو انہوں نے شطحات صوفیہ کے ضمن میں ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"ان شطحات سے دو مصیبتیں پیدا ہوئیں، ایک یہ کہ ان شطحات کی وجہ سے ایک جماعت ان بزرگوں سے بدظن ہوگئی اور ان کی پاکیزگی نفس، صدق معاملہ اور محاسن ان سے چھپ گئے اور ان حضرات کا مطلقاً انکار کردیا گیا۔ لوگ اُن سے بدگمان ہوگئے، حالانکہ یہ صریح زیادتی ہے۔ کیونکہ جس شخص سے کوئی غلطی ہوجائے اگر اس کے تمام محاسن کا انکار کردیا جائے تو تمام علوم اور صناعات بیکار ہوجائیں اور اُن کے نشانات مٹ جائیں۔ دوسری مصیبت یہ کہ بعض بزرگوں نے ان بزرگوں کے محاسن، صفاء قلب اور حُسنِ معاملہ کو دیکھ کر اُن کے شطحات کو بھی قبول کرلیا۔ ان سب

ہیں صحیح تر وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو اپنے مرتبہ میں رکھتے ہیں۔ صحیح کو قبول کرتے اور غلط کو رد کرتے ہیں"۔ [۱]

یہی حافظ ابن قیمؒ "مدارج السالکین" میں ایک موقع پر شیخ الاسلام ہرویؒ سے اختلاف کرتے ہیں، مگر فوراً ناظرین کو متنبہ کرتے ہیں کہ :-

"یہ غلطی شیخ الاسلامؒ سے بدظن نہ کر دے اور ان کے محاسن کو نظر سے گرا نہ دے، اس لیے کہ علم امامت معرفۃ اور سلوک میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے"۔ [۲]

حافظ موصوف کی یہی انصاف پسندی ہے کہ "شیخ الاسلام حبیبٌ الینا والحق احب الینا منہ" [۳] کے پیشِ نظر وہ ہرویؒ سے جابجا اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن اُن کے محاسن اور رسوخ علم کے اعتراف میں بھی پیش پیش ہیں، ایک موقع پر کہتے ہیں :-

"استشهاده بهذه الاية في هذا الباب يدل على رسوخه في العلم والمعرفة والقرآن"۔ [۴]

اور انجام کار یہی حافظ ابن قیمؒ انہیں صوفی شیخ الاسلام ہرویؒ کے متعلق کہتے ہیں :-

"اللہ شیخ الاسلام کی سعی کو مشکور فرمائے، اُن کے درجے بلند فرمائے، اُنکو بہترین جزا دے اور اُنکے محلِ کرامۃ میں ہم کو اور اُن کو جمع فرمائے"۔ [۵]

اب خاتمۂ سخن پر خاکسار کو یہ عرض کرنا ہے کہ جن لوگوں کو شیخ الاسلام

---

[۱] "مدارج السالکین" ج ۲ ص ۳ [۲] ایضاً ج ۱ ص ۱۰۸ [۳] ایضاً ج ۲ ص ۱۹

[۴] ایضاً ج ۳ ص ۱۲۲ [۵] ایضاً ج ۲ ص ۲۷

ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے حسن ظن ہے ان کو علمائے حق میں سے جانتے ہیں یا تو وہ یہ فیصلہ کر لیں کہ یہ سب حضرات با ایں ہمہ اتباعِ سنّت ایک غلط چیز کو قبول کرنے پر متفق ہو گئے تھے؟ اور ان سب نے عمداً یا جہلاً اُمت کو نادرست چیز کی تعلیم و تلقین کی؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود اپنے متعلق غور کریں کہ کہیں اس باب میں اُنہی سے تو غلطی نہیں ہو رہی ہے؟

ناچیز راقم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہمارے یہ معترضین و ناقدین اتنے اعتراض و تنقید کے وقت اس مروجہ تصوف کو پیشِ نظر رکھتے ہیں جس کی بارگاہ میں گستاخی کے مجرم ہم نیازمند بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم جس طرح اسرائیلیات کی بناء پر تفسیر کو، موضوعات کی بنا پر فنِ حدیث کو اور مرجوع مسائل کی بنا پر دفاتر فقہ کو رد نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح تصوف کے نام پر آج بہت سی خانقاہوں اور مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی بناء پر نفس تصوف کو ہم رد نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ بحمد اللہ اصل اور نقل کے امتیاز کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

*

اہلِ تصوّف اور دینی جدّوجہد

(از مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

دُنیا میں بہت سی چیزیں بعض خاص اسباب کی بناء پر بغیر علمی تنقید و تحقیق کے تسلیم کرلی جاتی ہیں اور ان کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی علمی بُنیاد نہیں ہوتی مگر خواص بھی ان کو زبان و قلم سے بے تکلف دُہرانے لگتے ہیں۔

انہی مشہوراتِ بے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوف تعطل و بے عملی حالات سے شکست خوردگی اور میدانِ جدوجہد سے فرار کا نام ہے لیکن عقلی و نفسیاتی طور پر بھی اور علمی اور تاریخی حیثیت سے بھی ہمیں اس دعوے کے خلاف مسلسل طریقہ پر داخلی و خارجی شہادتیں ملتی ہیں۔

سیرت سیّد احمد شہیدؒ میں تزکیہ و اصلاح باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسار راقم نے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے، جس میں آج بھی تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور اس حقیقت پر پہلے سے زیادہ یقین پیدا ہوگیا ہے۔

"یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سرفروشی و جانبازی، جہاد و قربانی اور تجدید و انقلاب و فتح و تسخیر کے لیے جس روحانی و قلبی قوت، جس وجاہت و شخصیت، جس اخلاص وللہیت، جس جذب و کشش اور جس حوصلہ اور ہمّت کی ضرورت ہے وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیبِ نفس، ریاضت و عبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ جنھوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں، اُن میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے۔ ان آخری صدیوں پر نظر ڈالیے۔ امیر عبدالقادر الجزائری، مجاہد جزائر، محمد احمد السودانی (مہدی سوڈانی) سید احمد شریف السنوسی (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے۔ حضرت سیّد احمد ایک مجاہد قائد کے علاوہ اور اس سے پہلے ایک عزیز القدر روحانی پیشوا اور بے مثل شیخ الطریقت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات و ریاضیات، تزکیۂ نفس اور قربِ الٰہی سے عشقِ الٰہی اور جذب و شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے ؎

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اس لیے روحانی ترقی اور کمالِ باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوقِ شہادت ہے اور اس درجے کی تکمیل جہاد ہے[1]۔"

---

[1] سیرت سید احمد شہید طبع ثانی ص ۔

نفسیاتی پہلو سے غور کیجئے گا تو معلوم ہو گا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہپر ہیں، جن سے جہاد وجد وجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادات و مالوفات مادّی مصالح و منافع، اغراض و خواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلند ہو سکتا ہے اور لکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ کے دام ہمرنگ زمین سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی "تقدیر سیمابی" اور تجلیوں کی بے تابی پیدا کر دی ہو۔

انسانی زندگی کا طویل تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط اور صرف نظم و ضبط، سرفروشی و جانبازی بلکہ سہل تر ایثار و قربانی کی طاقت و آمادگی پیدا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر مادی فائدہ کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلہ میں زندگی بار دوش معلوم ہونے لگے کسی ایسے ہی موقع اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا ؎

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست

اس نوید جاں فزا سے سر وبال دوش ہے

اس لیے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے اپنے حلقۂ مجاہدین میں یقین و محبت کی بھی روح پھونک دی تھی اور اپنے یقین و محبت کو سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں تک منتقل کر کے ان کے لیے تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور پامردی اور شہادت کی موت آسان و خوشگوار بنا دی تھی اور اُن کے لیے جینا اتنا ہی مشکل ہو گیا تھا، جتنا دوسروں کے لیے مرنا مشکل تھا،

یہی سر حلقۂ امامِ وقت ہے جس کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی اور بھی تیرے لیے دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

معمولی و معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے، فتح و نصرت کی حالت میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کسی غیر معمولی یقین و شخصیت کی ضرورت نہیں لیکن مایوس کن حالات اور قومی انتشار کی کیفیات میں صرف وہی مردِ میدان حالات سے کشمکش کی طاقت رکھتے ہیں جو اپنے خصوصی تعلق باللہ اور قوتِ ایمانی و روحانی کی وجہ سے خاص یقین و کیفیت عشق کے مالک ہوں۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تاریک وقفے آئے کہ ظاہری علم و حواس و قوتِ مقابلہ نے جواب دیدیا اور حالات کی تبدیلی امر محال معلوم ہونے لگی تو کوئی صاحبِ یقین و صاحبِ عشق میدان میں آیا، جس نے اپنی جراتِ رندانہ اور کیفیتِ عاشقانہ سے زمانہ کا بہتا ہوا دھارا بدل دیا۔ اور اللہ تعالےٰ نے یخرج الحی من المیت اور یحیی الارض بعد موتھا کا منظر دکھا دیا۔

تاتاریوں نے جب تمام عالمِ اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا، جلال الدین خوارزم شاہ کی واحد اسلامی سلطنت اور عباسی خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا تو تمام

عالمِ اسلام پر یاس و مردنی چھا گئی۔ تاتاریوں کی شکست ناممکن الوقوع چیز سمجھی جانے لگی اور یہ مثال زبان و ادب کا جزو بن گئی کہ اذا قیل لک ان التتار انھزموا فلا تصدق (اگر تم سے کوئی کہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو کبھی یقین نہ کرنا) اس وقت کچھ صاحبِ یقین و صاحبِ قلوب مردانِ خدا تھے جو مایوس نہیں ہوئے اور اپنے کام میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ تاتاری سلاطین کو مسلمان کر کے صنم خانہ سے کعبہ کے لیے پاسبان مہیا کر دیئے۔

ہندوستان میں اکبر کے دور میں ساری سلطنت کا رُخ الحاد و لادینیت کی طرف ہو گیا۔ ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ ایک وسیع و طاقتور سلطنت کے پورے وسائل و ذخائر کے ساتھ اسلام کا امتیازی رنگ مٹانا چاہتا تھا۔ اس کو اپنے وقت کے لائق ترین و ذکی ترین افراد اس مقصد کی تکمیل کے لیے حاصل تھے۔ سلطنت میں ضعف و پیرانہ سالی کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے کہ کسی فوجی انقلاب کی اُمید کی جا سکے۔ علم و ظاہری قیاسات کسی خوشگوار تبدیلی کے امکان کی تائید نہیں کرتے تھے۔ اس وقت ایک درویش بے نوا نے تن تنہا اس انقلاب کا بیڑہ اُٹھایا۔ اور اپنے یقین و ایمان، عزم و توکل اور روحانیت و للہیت سے سلطنت کے اندر ایک ایسا اندرونی انقلاب شروع کیا کہ سلطنتِ مغلیہ کا ہر جانشین اپنے پیشرو سے بہتر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اکبر کے تخت سلطنت پر بالآخر محی الدین اورنگ زیب نظر آیا۔ اس انقلاب کے بانی امامِ طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب عالمِ اسلام پر فرنگی "تاتاریوں" یا مجاہدینِ صلیب

کی یورش ہوئی تو اُن کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں جو مردان کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے۔ وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ بزرگ تھے، جن کے تزکیۂ نفس اور سلوک راہِ نبوت نے ان میں دین کی حمیت، کفر کی نفرت، دُنیا کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت دوسروں سے پیدا کر دی تھی۔ الجزائر (مغرب) میں امیر عبدالقادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے، نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا۔ مغربی مؤرخین نے ان کی شجاعت عدل و انصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

یہ مجاہد، ذوقاً و عملاً صوفی اور شیخ طریقت تھا، امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے :-

وکان المرحوم الامیر عبدالقادر متضلعاً من العلم والادب سامی الفکر، ذا نخ القدم فی التصوف لا یکتفی به نظراً حتی یمارسه عملاً، ولا یرحل الیه شوقاً حتی یعرفه ذوقاً وله فی التصوف کتاب سماہ (المواقف) فهو فی هذا المشرب من الافراد الا فذاذ ربما لا یوجد نظیرہ فی المتاخرین[1]۔

"امیر عبدالقادر مرحوم پورے عالم و ادیب، عالی دماغ اور بلند پایہ صوفی تھے، صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً بھی صوفی تھے، تصوف میں ان کی ایک کتاب (المواقف) ہے۔ وہ اس سلسلے کے یکتائے روزگار لوگوں میں سے تھے اور ممکن ہے کہ متاخرین میں ان کی نظیر دستیاب نہ ہوسکے۔"

---

[1] حاضر العالم الاسلامی جلد دوم صـ۱۴۳ ۔

دمشق کے زمانۂ قیام کے معمولات و اوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

وکان کل یوم یقوم الفجر ویصلی الصبح فی مسجد قریب من دارہ فی محلۃ العمارۃ لا یتخلف عن ذلک الا لمرض وکان یتہجد اللیل ویمارس فی رمضان الریاضۃ علی طریقۃ الصوفیہ ومازال مثالا للبر والتقویٰ والاخلاق الفاضلۃ الی ان توفی رحمہ اللہ سنۃ ۱۲۴۲ھ [1]	"روزانہ فجر کو اٹھتے صبح کی نماز اپنے گھر کے قریب کی مسجد میں جو محلہ العمارہ میں واقع ہے، پڑھتے، سوائے بیماری کی حالت کے کبھی اس میں ناغہ نہ ہوتا، تہجد کے عادی تھے اور رمضان المبارک میں حضرات صوفیہ کے طریقہ پر ریاضت کرتے، برابر سلوک وتقویٰ اور اخلاق فاضلانہ پر قائم رہتے ہوئے ۱۸۲۶ء میں انتقال کیا "

۱۸۱۳ء میں طاغستان [2] پر جب روسیوں کا تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے نقشبندی شیوخ تھے جنہوں نے علم جہاد بلند کیا اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد کی کہ معاملات ومقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کر دیا جائے، امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں :-

وتولی کبر الثورۃ علماؤھم و	اس جہاد کے علمبردار طاغستان کے

---

[1] ایضاً ص ۱۴۲ -

[2] طاغستان بحر خزر کے مغربی ساحل پر اسلامی آبادی کا ایک ملک ہے۔ اگر شمالی قفقاز کو اسکے ساتھ شامل کر دیا جائے تو ۲۰، ۳۰ لاکھ کے درمیان مسلمان آبادی ہوگی ۸۶ھ میں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیر اثر تھا -

شيوخ الطريقة النقشبندية المنتشر هناك وكانهم سبقوا سائر المسلمين الى معرفة كون مرد بهم هو من امر أنهم الذين اكثرهم يلبغون حقوق الامة بلقب ملك او امير وتبؤ كرسي وسرير ورفع علم كاذب ولذة فارغة باعطاء اوسمة ومراتب فثاروا منذ ذلك الوقت على الامراء وعلى الروسية حاميتهم وطلبوا ان تكون المعاملات وفقا لاصول الشريعة لا للعادات القديمة الباقية من جاهلية اولئك الاقوام وكان زعيم تلك الحركة غازي محمد الذي يلقبه الروس بقاضي ملا، وكان من العلماء المتبحرين فى العلوم العربية وله تاليف فى

کے علماء اور طریقۂ نقشبندیہ کے (جو داغستان میں پھیلا ہُوا ہے) شیوخ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان ان حکام سے پہنچتا ہے جو خطابات، عہدہ و اقتدار جھوٹی قیادت و سرداری، عیش و لذت اور تمغوں اور مرتبوں کی لالچ میں قوم فروشی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ سمجھ کر انہوں نے مُلکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف عَلم بغاوت بلند کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق ہو نہ کہ قوم کی قدیم جاہلی عادات سے۔ اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے، جن کو روسی قاضی ملاّ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ علوم عربیت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان جاہلی عادات کے ترک کرنے کے بارہ میں ان کی ایک

فی وجوب نبذ تلک العادات المقدیمة المخالفة للشرع اسمہ اقامۃ البرھان علی ارتداد عرفاء طاغستان "	تصنیف" اقامۃ البرھان علی ارتداد عرفاء طاغستان " (طاغستان کے چودھریوں اور برادری کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت) ہے "

۱۸۳۲ء میں غازی محمد شہید ہوئے اُن کے جانشین حمزہ بے ہُوئے۔ ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی جو بقول امیر شکیب، "امیر عبد القادر الجزائری رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر تھے اور مشخیت سے امارت ہاتھ میں لی تھی "۔

شیخ شامل نے ۲۵ برس تک رُوس سے مقابلہ جاری رکھا اور مختلف معرکوں میں اُن پر زبردست فتح حاصل کی۔ رُوسی ان کی شوکت اور شجاعت سے مرعوب تھے۔ اور چند مقامات کو چھوڑ کر سارے مُلک سے بے دخل ہو گئے تھے۔ ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں شیخ نے اُن کے سارے قلعے فتح کر لیے اور بڑا جنگی سامان مالِ غنیمت میں حاصل کیا۔ اس وقت حکومتِ رُوس نے اپنی پوری توجہ طاغستان کی طرف مبذول کی۔ طاغستان میں جنگ کرنے کے لیے باقاعدہ دعوت دی، شعراء نے نظمیں لکھیں اور پے در پے فوجیں روانہ کی گئیں۔ شیخ شامل نے اس کے باوجود بھی مزید دس برس تک جنگ جاری رکھی بالآخر ۱۸۵۹ء میں اس مجاہدِ عظیم نے ہتھیار ڈال لے۔

تصوف و جہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال سیدی احمد الشریف السنوسی کی

ہے۔ اطالویوں نے برقہ و طرابلس کی فتح کے لیے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا، نوآبادیوں اور بادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ یہ اطالویوں کی ناتجربہ کاری ہے۔ اس مہم میں ممکن ہے تین مہینے لگ جائیں۔ لیکن نہ پندرہ دن، نہ تین مہینے، اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے اور اطالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طریقہ پر سر نہ کر سکے۔ یہ سنوسی درویشوں اور ان کے شیخِ طریقت سیدی احمد الشریف کی مجاہدانہ جدوجہد تھی جس نے اطالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جمانے نہیں دیئے۔

امیر شکیب نے لکھا ہے کہ سنوسیوں کے کارنامے نے ثابت کر دیا کہ طریقہ سنوسیہ ایک پوری حکومت کا نام ہے، بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان جنگی وسائل کی مالک نہیں ہیں، جو سنوسی رکھتے ہیں۔ خود سیدی احمد الشریف کے متعلق اُن کے الفاظ ہیں :۔

وقد لحظت منه صبرا قل ان یوجد فی غیره من الرجال وعزما شدیدا تلوح سیماؤه علی وجهه فبینما هو فی تقواه من الابدال اذا هو فی شجاعته من الابطال۔	"مجھے سید سنوسی میں غیر معمولی صبر اور ثابت قدمی دکھائی دی جو کم لوگوں میں دیکھی گئی ہے، اولوالعزمی ان کے ناصیہ اقبال سے ہویدا ہے۔ ایک طرف اپنے تقوے وعبادت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے زمانے کے ابدال میں شمار ہونے کے قابل ہیں تو دوسری طرف شجاعت کے لحاظ سے

دلیرانِ زمانہ کی صف میں شامل ہونے
کے مستحق ہیں۔"

امیر شکیب نے صحرائے اعظم افریقہ کی سنوسی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ بڑی دل آویز اور سبق آموز ہے۔ یہ خانقاہ واحۃ الکفرہ میں واقع تھی اور سیدی احمد الشریف کے چچا اور شیخ السید المہدی کے انتظام میں تھی۔ اور افریقہ کا سب سے بڑا روحانی مرکز اور جہاد کا دار التربیت تھی۔ امیر مرحوم لکھتے ہیں :-

سید مہدی صحابہ و تابعین کے نقشِ قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے عملی آدمی تھے، ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت و اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے وہ اپنے برادرانِ طریقت اور مریدین کو ہمیشہ شہسواری، نشانہ بازی کی مشق کی تاکید کرتے رہتے۔ ان میں غیرت اور مستعدی کی رُوح پھونکتے، ان کو گھوڑ دوڑ اور سپہ سالاری کا شوق دلاتے رہتے اور جہاد کی فضیلت و اہمیت کا نقش ان کے دل پر قائم کرتے۔ ان کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور مختلف مواقع پر اُس کے اچھے نتائج بر آمد ہوئے۔ خصوصاً جنگِ طرابلس میں سنوسیوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے پاس ایسی مادی قوّت ہے جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے اور بڑی باجبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے، صرف جنگِ طرابلس

ہی میں سنوسیوں کا جوش وغضب ظاہر نہیں ہوا بلکہ علاقہ کانم
اور وادی سوڈان میں وہ ۱۳۱۹ھ سے ۱۳۳۲ھ تک فرانسیسیوں
سے برسرِ جنگ رہے ہیں۔

سید احمد الشریف نے مجھے سنایا کہ اُن کے چچا سید مہدی کے پاس
پچاس پچاس ذاتی بندوقیں تھیں، جن کو وہ بڑے اہتمام کے
ساتھ اپنے ہاتھ سے صاف کرتے اور پونچھتے تھے، اگرچہ اُن کے
سینکڑوں کی تعداد میں مریدین تھے، مگر وہ اس کے روادار نہ تھے کہ یہ
کام کوئی اور کرے تاکہ لوگ ان کی اقتداء کریں اور جہاد کی اہمیت
کو سمجھیں اور اس کے سامان وذخائر کا اہتمام کریں، جمعہ کا دن جنگی
مشقوں کے لیے مخصوص تھا۔ گھوڑوں کی ریس ہوتی، نشانہ بازی کی
مشق ہوتی وغیرہ وغیرہ۔

خود سید ایک بلند جگہ پر تشریف فرما ہوتے۔ شہسوار دو حصوں (پارٹیوں)
میں تقسیم ہو جاتے اور دوڑ شروع ہوتی۔ یہ سلسلہ دن چڑھے تک جاری
رہتا۔ کبھی کبھی نشانہ مقرر ہوتا اور نشانہ بازی شروع ہوتی۔ اس
وقت علماء و مریدین کا نمبر شہسواری و نشانہ بازی میں بڑھا ہی ہوا
ہوتا، کیونکہ اُن کے شیخ کی اُن کے لیے خاص تاکید تھی۔ جو لوگ گھوڑ دوڑ
میں بالا جیت لیتے یا نشانہ بازی میں بازی لے جاتے، اُن
کو قیمتی انعامات ملتے، تاکہ جنگی کمالات کا انہیں شوق ہو۔
جمعرات کا دن دستکاری اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے لیے

مقرر تھا، اُس دن اسباق بند ہو جاتے۔ مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لوگ مشغول ہوتے، کہیں تعمیر کا کام ہو رہا ہوتا، کہیں نجاری، کہیں لوہاری، کہیں پارچہ بافی، کہیں وراقی کا شغل نظر آتا۔ اس دن جو شخص نظر آتا وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا دکھائی دیتا۔ خود سید مہدی بھی پورے مشغول رہتے تاکہ لوگوں کو عمل کا شوق ہو۔

سید مہدی اور ان سے پہلے اُن کے والد ماجد کو زراعت اور درخت لگانے کا بڑا اہتمام تھا۔ اس کا ثبوت اُن کی خانقاہیں اور ان کے خانہ باغ ہیں، کوئی سنوسی خانقاہ ایسی نہیں ملے گی جس کے ساتھ ایک یا چند باغات نہ ہوں۔ وہ نئے نئے قسم کے درخت دور دراز مقامات سے اپنے شہروں میں منگواتے تھے۔ اُنھوں نے کفرہ اور جغبوب میں ایسی زراعتیں اور درخت روشناس کئے جن کو وہاں کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔

بعض طلباء سید محمد السنوسی (بانی سلسلۂ سنوسیہ) سے کیمیا سکھانے کی درخواست کرتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ "کیمیا ہل کے نیچے ہے" اور کبھی فرماتے "کیمیا کیا ہے ہاتھ کی محنت اور پیشانی کا پسینہ ہے"۔ وہ طلباء اور مریدین کو پیشوں اور صنعتوں کا شوق دلاتے اور ایسے جملے فرماتے جن سے اُن کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے پیشوں اور صنعتوں کو حقیر نہ سمجھتے اور نہ ان میں علماء کے مقابلے میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا۔ چنانچہ فرماتے تھے "بس تم کو

حُسنِ نیت اور فرائض کی پابندی کافی ہے، دُوسرے تم سے افضل نہیں " کبھی کبھی اپنے کو بھی پیشہ وروں میں شامل کرکے اور اُن کے ساتھ کام میں شرکت کرتے ہوئے فرماتے :-

" کیا یہ کاغذوں والے (علماء) اور تسبیحوں والے (صوفیہ وذاکرین) سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالےٰ کے یہاں سبقت لے جائیں گے۔ نہیں خدا کی قسم! وہ ہم سے کبھی سبقت نہیں لے جا سکتے " [1]

عالمِ اسلامی پر سید جمال الدین افغانی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت و دعوت نے جو اثر ڈالا ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نئے دُنیائے اسلام کے معماروں میں ہیں۔ سید جمال الدین افغانی " سرتا پا دعوت وعمل اور ایک شعلۂ جوالا تھے، جس نے افغانستان سے لیکر ترکی تک تمام عالم اسلام میں حمیت اسلامی کی رُوح اور اتحاد اسلامی کا صور پھونکا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کے سوزِ دروں اور گرمیٔ نفس میں اور ان کی بے چین طبیعت اور مسلسل جدوجہد میں ذکرِ قلبی اور باطنی بیداری کو بھی دخل ہے۔ جس کے بغیر اکثر آدمی مسلسل محنت اور مخالفتوں اور مایوس کن حالات کا ہمیشہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی حال ان کے شاگرد رشید اور دستِ راست شیخ محمد عبدہ کا ہے جو تصوّف کے لذّت آشنا اور اس

---

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۱۶۳، ص ۱۶۴ -

کوچہ سے واقف تھے [1]

معاصر دینی تحریکوں میں الاخوان المسلمون کی تحریک سب سے زیادہ طاقتور اور منظم تحریک ہے اور عالمِ عربی کے لیے تو وہ احیائے دین اور اسلام کی نشأت ثانیہ کی واحد تحریک ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زندگی سے پورا ربط ہے اور ممالک عربیہ کی عمومی زندگی پر اس نے بڑا گہرا اور محسوس اثر ڈالا ہے، اس کے بانی شیخ حسن البنا مرحوم کی شخصیت بڑی موثر، دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت تھی، وہ سر تا پا عمل اور مجسّم جدوجہد تھے۔ نہ تھکنے والے، نہ مایوس ہونیوالے نہ پست ہونے والے سپاہی اور داعی تھے۔ ان کی ان خصوصیات میں ان کے روحانی نشوونما اور سلوک کو بڑا دخل ہے۔ وہ جیسا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح میں تصریح کی ہے۔ طریقہ حصافیہ شاذلیہ میں بیعت تھے اور باقاعدہ اس کے اذکار و اشغال کی ورزش کی تھی [2]

ان کے خواص اور معتقدین نے بیان کیا کہ وہ زندگی کے آخری مصروف ترین دنوں میں بھی اپنے اوراد و معمولات کے پابند رہے۔ اخوان کی پانچویں موتمر ۱۳۵۸ھ میں انہوں نے اخوان کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف میں حسب ذیل جملے کہے تھے :-

---

[1] مجھ سے قاہرہ میں مصر کے مشہور فاضل و مصنف ڈاکٹر احمد امین بے نے (جن کو شیخ محمد عبدہ سے شخصی واقفیت اور اسباق میں شرکت کا شرف حاصل ہے) سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ کی اس مناسبت اور اشغال کا ذکر کیا۔ [2]

دعوة سلفية وطريقة	ایک ایسی جماعت جس میں
سنية وحقيقة صوفية	سلف کی دعوت اہلِ سنت
وهيئة سياسية و رياضة	کا طریقہ، تصوف کی حقیقت،
رياضية ورابطة علمية	سیاست، ورزش، علم وثقافت
ثقافية وشركة اقتصادية	اقتصادی تعاون اور اجتماعی
وفكرة اجتماعية [۱]	فکر جمع ہیں۔

ہندوستان میں تصوّف وجہاد کا ایسا عجیب امتزاج واجتماع ملتا ہے جس کی نظیر دُور دُور ملنی مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت سیّد احمد شہیدؒ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے ان کی یہ جامعیت مسلّمات میں سے ہے اور حدِّ تواتر کو پہنچ چکی ہے۔ ان کے رفقاء کے جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوشِ جہاد، شوقِ شہادت، محبتِ دینی بُغض فی اللہ کے واقعات قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

جب کبھی اُن کے مفصّل واقعات سامنے آئیں گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ قرونِ اولیٰ کا ایک بچا ہُوا ایمانی جھونکا تھا جو تیرھویں صدی میں چلا تھا۔ [۲] اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح تعلق باللہ اور راہِ نبوّت کی تربیت وسلوک میں کتنی قوت اور کیسی تاثیر ہے اور بغیر صحیح روحانیت اور اصلاح کے سخت جوشِ وجذبہ اور ایثار وقربانی رجان سپاری

---

[۱] رسالہ المؤتمر الثانی ص ۱۸ ، ۱۹ ۔

[۲] ان تفصیلی واقعات کے لیے ملاحظہ ہو سیرت سیّد احمد شہیدؒ حصّہ دوم (غیر مطبوعہ)

کی اُمید غلط ہے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی، سید صاحبؒ کے پرتو تھے۔ ان کے جانشینوں میں مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں حیثیتوں کے جامع تھے۔ ایک طرف اُن کے جہاد و ابتلاء اور امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبل کی یاد کو تازہ کرتے ہیں اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر، کبھی انبالہ کے پھانسی گھر میں اور کبھی جزیرہ انڈمان میں محبوس نظر آتے ہیں۔ دُوسرے وقت وہ سلسلۂ مجددیہ و سلسلۂ محمدیہ (سید صاحبؒ کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت و تعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ہندوستان کی پُوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جدوجہد اور قربانیاں اگر ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور اہلِ صادقپور کی جدوجہد اور قربانیاں دُوسرے پلڑے پر تو شاید یہی پلڑا بھاری رہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہلِ سلسلہ اور اصحاب ارشاد دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ نشین نظر نہیں آتے۔ شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ ضامن، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہم) انگریزوں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ حضرت حافظ ضامن

وہیں شہید ہوتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کر جانی پڑتی ہے، مولانا نانوتویؒ و مولانا گنگوہیؒ کو عرصہ تک گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑتا ہے۔

پھر مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو اُن کے وجود سے پاک کر کے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اقتدارِ اعلیٰ اور اُن کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو۔ ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستان و افغانستان و ترکی کو ایک سلسلۂ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ریشمی خطوط، انور پاشا کی ملاقات، مالٹا کی اسارت، ان کی علو ہمتی اور قوتِ عمل کا ثبوت ہے۔

من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا۔

ان مسلسل تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہو گا کہ تعطل و بے عملی حالات کے مقابلے میں سپر اندازی اور پسپائی تصوف کے لوازم میں سے ہے۔ اگر اس دعوے کے ثبوت میں چند متصوفین اور اصحابِ طریقت کی مثالیں ہیں تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ان ائمہ فن اور شیوخِ طریقت کی مثالیں ہیں جو اپنے مقام اور رسوخ فی الطریقہ میں بھی اوّل الذکر اصحاب

سے بڑھے ہوئے ہیں۔

اگر تصوف اپنی صحیح رُوح اور سلوک راہِ نبوّت کے مطابق ہو اور یقین اور محبت پیدا ہونے کا باعث ہو (جو اس کے اہم ترین مقاصد و نتائج ہیں) تو اس سے قوتِ عمل، جذبۂ جہاد، عالی ہمتی، جفاکشی، شوقِ شہادت پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب محبتِ الٰہی کا چشمہ دل سے اُبلے گا تو رؤیں رؤیں سے یہ صدا بلند ہوگی ؎

اے آنکہ زنی دم از محبت
از ہستیٔ خویشتن پرہیز
برخیز و بہ تیغ تیز بنشیں
یا از رہ دوست برخیز

(۸)

تصوّف و احسان

کے طالبوں کو چند ابتدائی مشورے

"اس کتاب کے ابتدائی پانچ مقالات جب باقساط "الفرقان" میں شائع ہوئے تو بعض حضرات نے ان کو پڑھ کر اصرار فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے جن بندوں کے دلوں میں ان کے مطالعہ سے دین کے اس شعبہ کی ضرورت کا احساس اور اس کی تحصیل کی چاہت پیدا ہو، ان کو کچھ ایسے ابتدائی مشورے دینا بھی ضروری ہیں جن کی روشنی اور راہنمائی میں — وہ اگر چاہیں تو بلا تاخیر اپنا سفر شروع کر سکیں۔ کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے احساسات پر اگر جلدی عملی قدم نہ اٹھایا جائے تو بالآخر وہ مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے چند ابتدائی مشورے عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوا۔ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں

کو ان سے فائدہ پہنچائے "۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

اللہ کے جن بندوں کے دل میں دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب اور اس کی تحصیل کا داعیہ پیدا ہو، اُن کو چاہیئے کہ :-

سب سے پہلے تو اپنی نیت صحیح کریں۔ یعنی اپنے نفس کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی عبدیت کے تعلق کی درستی اور اللہ تعالےٰ کی رضا مندی کو مقصود بنائیں۔ کشف و کرامات کی طلب یا بزرگی اور بڑائی حاصل کرنے کی ہوس ایک طرح کا شرک ہے۔ اس لیے اس طرح کا کوئی مقصد دل کے کسی گوشہ میں بھی باقی نہ رہنے دیں۔

پھر نیت اور ارادہ کی اس تصحیح کے بعد اس راستہ کی راہنمائی اور رہبری کے لیے اللہ کے کسی ایسے صالح اور صاحبِ ارشاد بندے کی طرف رجوع کریں جو اس کے اہل ہوں اور طبیعت کو بھی جن کے ساتھ مناسبت ہو اور جن کی خدمت میں پہنچنا اور صحبت سے فیضیاب ہونا زیادہ مشکل نہ ہو۔

اگر ایسے حضرات سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے خود فیصلہ اور انتخاب مشکل ہو تو بہتر یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ اور دین میں بصیرت رکھنے والے نیک صالح لوگوں سے مشورہ لیں اور اپنے زمانہ کے جن جن بزرگوں کے متعلق وہ رائے دیں اُن کی خدمت میں جائیں اور چند چند دنوں ٹھہر کر خود دیکھیں اور جہاں طبیعت کی مناسبت محسوس ہو اور دل میں جن کی عظمت اور محبت زیادہ

پیدا ہو اور جن سے اپنے کو نفع کی زیادہ اُمید ہو، اُن ہی کو اپنے لیے انتخاب کرلیں اور اگر مخلص اور اہل مشیروں کے مشورے ہی سے کسی بزرگ کی طرف رجوع کرنے کے لیے اپنی رائے قائم ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اُن ہی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کر لیا جائے۔ لیکن آخری فیصلہ کرنے اور اپنی طلب اور ارادت کا اُن سے اظہار کرنے سے پہلے بطریقِ مسنون استخارہ بہرحال کر لیا جائے جس کا طریقہ حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ :-

"پہلے اہتمام سے وضو کیا جائے، اس کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھی جائے اور سلام کے بعد دل کی پوری توجہ کیساتھ اللہ تعالیٰ سے اس طرح دُعا کی جائے" :-

اللّٰھم انی استخیرک[۱]	"اے اللہ! میں تیرے علم محیط سے اپنی بہتری
بعلمک واستقدرک	چاہتا ہوں (تو ہی اپنے محیط علم سے بہتری کیطرف
بقدرتک واسألک من	میری رہنمائی فرما) اور تیری قدرتِ کاملہ سے (اپنی
فضلک العظیم فانک	بہتری پر) قدرت مانگتا ہوں اور تیرے فضلِ عظیم
تقدر ولا اقدر وتعلم	سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تُو قادر ہے اور میں عاجز

[۱] دُعائے استخارہ کے یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں، اس کے راوی حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو استخارہ کی یہ دُعا ایسے اہتمام سے سکھاتے تھے جیسے اہتمام سے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے تھے"۔

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری شریف)

ولا اعلم وانت علام	ہوں اور تو سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ
الغیوب ۔ اللھم ان	نہیں جانتا اور تُو تو سب غیبوں کا بھی جاننے والا
کنت تعلم ان ھذا	ہے۔ اے اللہ! اگر یہ کام (جسکے بارے میں میں
الامر خیر لی فی دینی	استخارہ کر رہا ہوں[1]) تیرے علم میں میرے لیے
ومعاشی وعاقبة	میرے دین اور میری دنیا اور میری آخرت کے لیے
امری فاقدرہ لی	بہتر ہے اور اس میں میرے لیے خیر ہے تو اسکو
ویسرہ لی ثم بارک	میرے واسطے مقدر فرما دے اور اس کا حاصل کرنا
لی فیه وان کنت	میرے لیے آسان کر دے پھر اسکو باعثِ خیر و برکت
تعلم ان ھذا الامر	بھی بنا دے اور اگر تیرے علم میں اس کام کا
شر لی فی دینی ومعاشی	انجام میرے لیے، میرے دین، میری دنیا اور میری
وعاقبة امری فاصرفه	آخرت کے لیے بُرا ہے تو اسکو میری طرف سے پھیر دے
عنی واصرفنی عنه	اور میرے دل کو اسکی طرف سے پھیر دے اور جہاں
واقدر لی الخیر	کہیں میرے لیے بہتری ہو اس کو میرے
حیث کان ثم	واسطے مقدر کر دے۔ پھر میرے دل کو اس
ارضنی به ۔	پر راضی اور مطمئن بھی کر دے ۔

[1] یہاں اس کام اور اس مقصد کا تصور کرنا چاہیے جس کے بارے میں استخارہ کرنا ہو مثلاً کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے کے سلسلے میں استخارہ کرنا ہو تو اسی مقصد کا دل میں تصور کیا جائے۔

استخارہ کے بعد اگر دل کا وہ رجحان ویسا ہی رہے یا اور ترقی کر جائے تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے خیر اور برکت کی امید کرتے ہوئے بنام خدا ان ہی بزرگ کی طرف رجوع کرنے اور اُن سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ اور اگر استخارہ کے بعد دل اُدھر سے ہٹ جائے تو پھر کسی اور کے متعلق سوچیں۔

بہرحال استخارہ کے بعد دل کا جو رجحان ہو (خواہ کسی خواب وغیرہ کی رہنمائی سے ہو یا آپ سے آپ ہو) اسی کو استخارہ کا نتیجہ سمجھ کر اس کے مطابق عملدرآمد کرنا چاہیئے۔

اور اگر ایک دفعہ کے استخارہ کے بعد کوئی رجحان نہ پیدا ہو تو چند بار اسی طرح استخارہ کرنا چاہیئے۔ انشاء اللہ تعالےٰ کوئی نہ کوئی رجحان ضرور پیدا ہو جائے گا اور طبیعت اس طرف مائل کر دی جائے گی جس میں بہتری ہو گی۔

بہرحال استخارہ کے بعد جب دل کا رجحان کسی بزرگ کی طرف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے خیر اور سعادت کی دعا کرتے ہوئے اپنا مقصد ان سے عرض کریں اور اپنی رہنمائی میں لینے کی اُن سے درخواست کریں۔ بیعت کا مقصد اور ارادت کی اصل حقیقت بس یہی ہے [1]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ بیعتِ تربیت جس کا یہاں ذکر ہے اسی لیے کی جاتی ہے۔ بیعت برکت اور بیعت توبہ کا ذکر یہاں نہیں ہے۔ ۱۲

پھر وہ بزرگ جو کچھ ہدایت اور تعلیم فرمائیں اور جو مشورے دیں ان کی اس سے زیادہ اہتمام سے تعمیل اور پابندی کریں جتنے اہتمام سے جسمانی مریض اپنے معالج، حکیم یا ڈاکٹر کے طبی مشوروں کی پابندی کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ اس راہ کی رہنمائی کے لیے جن کو انتخاب کیا جائے ان میں پہلے ہی یہ چند چیزیں ضرور دیکھ لی جائیں، تاکہ تعلق کی بنیاد پورے اطمینان اور اعتماد پر ہو :-

(الف) وہ دین اور شریعت سے واقف ہوں اور ان کے یہاں شریعت و سنت کے اتباع کا پورا اہتمام ہو۔

(ب) ان کے احوال سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں اور ان کی طلب اور رغبت کا رُخ دُنیا اور اس کے جاہ و مال کی طرف نہیں، بلکہ اللہ اور آخرت کی طرف ہے۔

(ج) سلوک میں اتنی بصیرت رکھتے ہوں کہ طالب کے حالات کی رعایت رکھتے ہوئے اس کی رہنمائی اور رہبری کر سکیں۔

(د) ان کے طرزِ عمل سے اس کا اندازہ ہو کہ طالبوں اور تعلق رکھنے والوں سے وہ شفقت رکھتے ہیں اور خیر خواہی اور نفع رسانی کی فکر اور کوشش کرتے ہیں۔

(ھ) دین کے اس شعبہ (سلوک) کی تحصیل انہوں نے کسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں کی ہو اور اُن کی صحبت اُٹھائی ہو اور انہوں نے ان کو رُشد و تربیت کا اہل قرار دیا ہو۔

(و) جو لوگ ان سے تعلق رکھتے ہوں اور دین کے سلسلے میں اُن کے

پاس آتے جاتے ہوں، اُن کو دینی نفع ہوتا ہو، اور آخرت کی فکر ان میں بڑھتی ہو۔

اگر ان چیزوں کو دیکھ بھال کر اور اپنے دل کا اطمینان کر کے اللہ کے کسی بندہ کے ساتھ راہِ سلوک میں استفادہ کا تعلق قائم کیا جائے گا اور اپنے کو ان کی رہنمائی میں دے دیا جائے گا تو انشاء اللہ تعالےٰ ہرگز محرومی نہ رہے گی۔

اور اگر کسی بندۂ خدا کے دل میں دین کے اس شعبہ کی طلب اور اپنے نفس کی اصلاح کا داعیہ اللہ تعالےٰ کی عنایت سے پیدا ہو، لیکن کسی وجہ سے وہ کسی شیخ کا انتخاب اپنے لیے نہ کر سکیں تو اُن کے لیے یہ بہتر ہو گا کہ کسی شیخ کی طرف رجوع ہونے تک مندرجہ ذیل طریقہ سے بنامِ خدا اپنا کام شروع کر دیں۔

پہلے اہتمام سے خوب اچھی طرح وضو کریں، پھر جہاں تک ہو سکے پُورے خشوع وخضوع کے ساتھ دو رکعت نفل نماز پڑھیں اور اس کے بعد اللہ تعالےٰ کو موجود اور حاضر ناظر یقین کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی اس سے معافی چاہیں اور آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے کا اور شریعت پر چلنے کا دل سے عزم اور عہد کریں اور اس بارہ میں اللہ ہی سے توفیق اور مدد مانگیں۔

اگر پچھلی زندگی میں اللہ کے کچھ فرائض یا اُس کے بندوں کے کچھ حقوق اپنے ذمّہ رہ گئے ہیں تو اُن کی ادائیگی کی فکر کریں اور اس کا طریقہ معلوم کرنے کے لیے اگر

ضرورت ہو تو کسی متقی عالم دین کی طرف رجوع کریں۔

اللہ تعالیٰ کے فرائض میں نماز کی بے حد اہمیت ہے اور دینی ترقیوں کا سب سے اعلیٰ ذریعہ نماز ہی ہے اس لیے اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر اور خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھنے کی پوری کوشش کریں اور اس کوشش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں [1]

فرض نمازوں اور مؤکدہ سُنتوں کے علاوہ نوافل کی بھی عادت رکھیں، خصوصاً تہجد کی پابندی کی کوشش کریں۔ اگر اخیر شب میں اُٹھنے کی عادت نہ ہو تو عادت پڑ جانے تک عشاء کی نماز کے بعد ہی وتر سے پہلے آٹھ رکعت نفل (دو دو رکعت کر کے) بہ نیت تہجد پڑھ لیا کریں۔ اگر وقت تنگ ہو تو چھ یا چار یا دو رکعت ہی پڑھ لیں۔

دن رات کے اپنے اوقات میں کوئی وقت اطمینان اور یکسوئی کا خاص ذکر کے لیے مقرر کریں اور اس وقت میں نفی اثبات یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر کریں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دل و دماغ کو حاضر و یکسو کر کے تجدیدِ ایمان کی نیّت سے پورا کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ معنی مطلب کے دھیان کے ساتھ تین دفعہ پڑھیں۔ پھر تین مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھیں، پھر مدّ اور شدّ کی پوری رعایت رکھتے ہوئے نفی اثبات (لا الٰہ الا اللہ)

---

[1] اس عاجز کے رسالہ "نماز کی حقیقت" سے انشاء اللہ اس سلسلہ میں کافی مدد مل سکے گی۔ بہت سے اللہ کے بندوں نے بتلایا ہے کہ اس کے مطالعہ سے ان کو بہت فائدہ ہوا۔ ۱۲

گیارہ سو دفعہ پڑھیں اور دل سے "لا مقصود الا اللہ" کا دھیان کریں۔ اگر یہ ذکر ہلکی آواز کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ لا الٰہ کہتے وقت جسم کو ذرا داہنی طرف جھکایا جائے اور اللہ کہتے وقت بائیں جانب مائل کر قلب پر ہلکی سی ضرب لگائی جائے تو تجربہ ہے کہ اس سے قلب پر اثر زیادہ اور جلدی پڑتا ہے اور اگر ہمت اور وقت میں وسعت ہو تو گیارہ سو نفی اثبات کے علاوہ خواہ اسکے ساتھ ہی، خواہ کسی اور وقت میں تین ہزار یا دو ہی ہزار دفعہ ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ بھی کیا کریں اور اس میں شد و مد کا لحاظ رکھیں۔

اور بہتر ہے کہ یہ ذکر بھی خفیف جہر سے اس طرح کریں کہ قلب کی بھی اس میں شرکت ہو۔[1]

اس ذکر نفی و اثبات و اسم ذات کے علاوہ ہر نماز کے بعد تسبیحاتِ فاطمہ یعنی ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کو بھی معمول بنالیں۔

---

[1] یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذکر میں جہر و ضرب وغیرہ ذکر کی تاثیر بڑھانے کی ایک تدبیر ہے۔ اس سے اجر و ثواب میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی اور اس کی ضرورت صرف مبتدیوں کو ہوتی ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مشائخ میں جہر و ضرب وغیرہ کے مختلف طریقے رائج ہیں اور اپنے اپنے تجربہ کے احوال کے لحاظ سے ذکر کی مقدار بھی مختلف بتائی جاتی ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ ابتداء میں ہر قسم کے طالب کے لیے یہ مناسب رہے گا۔ نیز ذکر کا صحیح طریقہ مل کر زبانی ہی سیکھا جاسکتا ہے۔ اوپر جو طریقہ لکھا گیا ہے وہ بس اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ کسی صاحبِ ذکر سے سیکھنے کی نوبت آئے۔ ۱۲

نیز سوتے وقت بھی تسبیحاتِ فاطمہ اور استغفار و درود شریف سو سو دفعہ پڑھ لیا کریں۔

اس کے علاوہ چلتے پھرتے اور اُٹھتے بیٹھتے ذکر یا دُعا کا کوئی کلمہ پڑھنے کی عادت ڈال لیں۔ مثلاً سبحان اللہ و بحمدہ یا لا الہ الا اللہ یا آیت کریمہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظٰلمین یا استغفر اللہ ربی یا حی یا قیوم برحمتک استغیث یا اس قسم کا کوئی کلمہ۔

بہرحال اس کی عادت پڑ جائے کہ اپنے کاموں میں مشغولی کے وقت بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کلمہ زبان پر آتا رہے اور اس کے ذریعہ دل میں اللہ کی یاد اور اس کی طرف توجہ تازہ ہوتی رہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بھی کوئی وقت مقرر کر لینا چاہیئے۔ اگرچہ وہ وقت تھوڑا ہی ہو اور زیادہ نہ ہو سکے تو ایک دو ہی رکوع کی تلاوت کر لی جائے اور ذکر ہو یا تلاوت زیادہ سے زیادہ توجہ اور دھیان کے ساتھ اور دل کے ذوق شوق کے ساتھ ہو۔ پھر چند منٹ کا کوئی مناسب وقت اس کے لیے بھی مقرر کیا جائے کہ روزانہ اس وقت دل و دماغ کو ہر چیز سے خالی اور یکسو کر کے موت اور اس کے بعد جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا مراقبہ کیا جائے۔ یعنی سوچا جائے کہ ایک دن ضرور ایسا آنے والا ہے کہ میں اس دُنیا سے اُٹھا یا جاؤں گا۔ پھر نہلانے، کفنانے اور نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد لوگ مجھے قبر میں دفن کر آئیں گے۔ پھر قبر میں اس طرح سوال و جواب ہوگا۔ اس کے بعد سینکڑوں یا ہزاروں برس مجھے تنہا اس قبر میں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد ایک وقت قیامت آئیگی پھر حشر نشر ہوگا،

پھر حساب ہوگا اور میرا اعمال نامہ میرے سامنے لایا جائے گا جس میں میرے سارے اعمال درج ہوں گے اور اللہ کے فرشتے گواہی دیں گے اور خود میرے اعضاء ہاتھ پاؤں وغیرہ میرے خلاف گواہ ہوں گے۔ اس وقت اللہ کے سامنے میرا کیا حال ہوگا؟ پھر میرا فیصلہ سنایا جائے گا اور مجھے اس جگہ بھیج دیا جائے گا جس کا میں سزاوار ہوں گا۔

بہرحال آنے والے ان سب واقعات کا تصوّر اس طرح کیا جائے کہ گویا یہ سب کچھ گزر رہا ہے اور پھر خوف اور ڈر سے بھرے دل سے اللہ سے استغفار کیا جائے اور گناہوں کی معافی چاہی جائے اور رحم اور کرم کی التجا کی جائے۔

ان چند چیزوں کی پابندی کے ساتھ جیسا کہ پہلے بتلایا جاچکا ہے، گناہوں سے بچنے کی پوری کوشش کی جائے اور جب کبھی کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو جلدی اس سے توبہ کرلی جائے۔

گناہوں کے سوا دو اور چیزوں میں بھی خاص طور سے احتیاط کی جائے ایک یہ کہ ضرورت سے زیادہ کھانے کی عادت چھوڑی جائے۔ یعنی اتنا کھایا جائے جس سے قوت پوری قائم رہے اور سستی نہ آئے، جو زیادہ پیٹ بھرنے سے آتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ بات صرف ضرورت سے کی جائے۔ یعنی صرف وہ باتیں کی جائیں جو دین یا دنیا کی حیثیت سے ضروری اور مفید ہوں اور ہمیشہ سوچ کر بولنے کی عادت ڈالی جائے۔

اس سلسلہ کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اپنے کو دوسروں سے کمتر اور

دُوسروں کو بہتر اور برتر سمجھنے کی۔ اسی طرح اپنے نفس کے ساتھ بدگمانی کرنے اور دوسروں کے ساتھ نیک گمانی کرنے کی عادت ڈالی جائے۔

اور سب سے آخری بات یہ کہ ان تمام چیزوں کے بارہ میں اپنا احتساب اور اپنی نگرانی پُورے اہتمام سے کی جائے۔ بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ۔

ہر طالب کو اپنا کام شروع کرنے کے لیے یہ چند مشورے انشاء اللہ بالکل کافی ہوں گے اور اللہ کی رحمت سے اُمید ہے کہ آگے کے لیے رہنمائی و دستگیری حق تعالےٰ کی طرف سے ہوتی رہے گی۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبُلنا و ان اللہ لمع المحسنین

اِنتباہ

ان مشوروں کے متعلق ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ اُن کے بعد کسی صاحبِ ارشاد سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، بلکہ ان کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جن حضرات میں اللہ تعالےٰ کی توفیق سے دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب پیدا ہو جائے اور اپنے خاص حالات کی وجہ سے کسی صاحبِ ارشاد سے جلدی وہ استفادہ نہ کرسکیں تو ان مشوروں کے مطابق کام شروع کر دیں اور جب اپنے لیے کسی روحانی مصلح کا انتخاب کر لیں تو اپنے کو اس کی رہنمائی کا پابند کر دیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس راہ میں پوری رہنمائی کسی زندہ ہستی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

محمد منظور نعمانی

بخاری شریف کی منتخب احادیث کا ترجمہ اور بے مثل تشریح

رحمۃ القدوس ترجمہ شرح بہجۃ النفوس

(ترجمہ و تشریح)

تخریج احادیث

امام بخاری قدس اللہ سرہ العزیز ۲۵۶ھ

عربی شرح
علامہ ابن ابی جمرہ مالکی اندلسیؒ
۶۹۹ھ

اردو ترجمہ و تشریحی فوائد
حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رح
۱۳۹۴ھ

زیر نگرانی
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳۶۲ھ

احادیث شریفہ سے مسائل سلوک و تصوف، مسائل اخلاق و آداب اور مسائل فقہ کے استنباط پر وہ گرانمایہ کتاب جو ہر دور میں علماء، صوفیاء اور دیندار حضرات کی توجہ کا متفقہ طور پر مرکز رہی ہے۔ بخاری شریف کی منتخب احادیث کی بے نظیر شرح

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انار کلی ○ لاہور

اکابر علماءِ دیوبند رحمہم اللہ

برِصغیر پاک و ہند کے ۶۸ ممتاز اکابر علماءِ دیوبندؒ
کے حالات و کمالات اور خدماتِ جلیلہ کا جامع تذکرہ

تألیف

حافظ محمد اکبر شاہ صاحب بخاری

ادارہ اسلامیات

۱۹۰- انارکلی لاہور